Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1974

طلوعِ اسلام کنونشن

۲۴ تا ۲۷ اکتوبر

۲۵ بی، گلبرگ، لاہور

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ۔ سالانہ ۱۳ روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوع اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدل اشتراک
۱½ ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ — خط وکتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵ بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور	سالانہ: پاکستان ——— ۱۵ روپے؛ غیر ممالک سالانہ ——— ۱½ پونڈ

نمبر ۱۰	اکتوبر ۱۹۷۴ء	جلد نمبر ۲۷

فہرست

۱۔ لمعات ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۲

۲۔ طلوع اسلام کنونشن ——— ۱۸

۳۔ حقائق وعبر (اللہ کا شاہکار ۔ کون؟) (بقیہ حصہ کفن (قانون شریعت میں تبدیلی) ——— ۲۰
(ایک انکشاف) (تحقیقہ محترم جیبقا ڈاکٹر مہم شتی) (اسے نوٹ کر لیجئے)

۴۔ شہدائے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یادیں ——— محترم پرویز صاحب ——— ۲۵

۵۔ ختم نبوت اور تحریک "احمدیت" ——— ۴۸

۶۔ ایشیائی ڈرامہ اور غربت اقوام ——— (محترم رفیع اللہ صاحب) ——— ۴۹

۷۔ طلوع اسلام کالج فنڈ ——— (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ) ——— ۵۲

۸۔ حفاظت قرآن کے متعلق شبہات اور ان کا جواب ——— ۵۳

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور۔ پرنٹر: محمد محسن۔ مطبوعہ: لاہور آرٹ پریس، انارکلی لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زیرِ نظر لمعات، پرویز صاحب کے رشحاتِ قلم کی نذر ہیں۔ مدیر

۸ ستمبر (اتوار) کی صبح جب میں اپنے ہفتہ واری درسِ قرآن کریم کے لئے بیٹھا، تو یہ الفاظ بے ساختہ میری زبان پر آ گئے۔

عزیزانِ گرامی قدر!

آج کا دن میری زندگی کا مبارک ترین، شاداب ترین، حسین ترین، کامیاب ترین دن ہے کہ آج میرا عمر بھر کا مشن تکمیل کی منزل تک پہنچ گیا۔ تحفظِ ناموسِ رسالت، جسے ختمِ نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے، میرے ایمان کی بنیاد اور میری زندگی کا مقصد رہا، اور ہے۔ للہ الحمد کہ میری یہ آرزو پوری ہوئی۔ میرا یہ مقصد اس شکل میں حاصل ہوا کہ مملکت پاکستان نے آئینی اور قانونی رُو سے فیصلہ کر دیا کہ ختمِ نبوت کا منکر مسلمان قرار نہیں پا سکتا۔ اسے امتِ محمدیہ کا فرد تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ میرے لئے یہ دن بارگاہِ ایزدی میں ہزار ہا سجدۂ شکرانہ ادا کرنے کا دن، اور یہ ساعت، بحضورِ رسالتمآبؐ گلہائے تہنیت و عقیدت پیش کرنے کی ساعتِ سعید ہے۔

میں نے جو کہا ہے کہ تحفظِ ناموسِ رسالتؐ میرا عمر بھر کا مشن ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ یہ ایک حقیقتِ نفس الامری کا اظہار ہے۔ میری پیدائش (سابقہ مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کے مشہور قصبہ) بٹالہ میں ہوئی اور تعلیم و تربیت خالص مذہبی ماحول میں۔ میرے دادا جان (علیہ الرحمۃ) مسلک حنفی کے ایک جید عالم اور مشربِ چشتیہ نظامیہ سے متوسل ایک ممتاز صوفی تھے۔ میری تعلیم و تربیت انہی کی آغوش میں ہوئی۔ بٹالہ بڑا مذہبی شہر تھا۔ اور اُس زمانے کی عام روش کے مطابق، مناظروں کا مرکز۔ یہ مناظرے غیر مسلموں (آریوں اور عیسائیوں) کے ساتھ بھی ہوتے تھے اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین بھی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی ان مناظروں سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے مجھے مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعہ اور بین الفرق اختلافاتی مسائل پر تحقیق و تفحص کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں نے کافی وقت اس پر صرف کیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت، قادیانی تحریک کو حاصل تھی۔ ایک تو اس لئے کہ اُس زمانے میں یہ تحریک نئی نئی ابھری تھی۔

اور دوسرے اس لئے کہ بٹالہ قادیان آنے جانے والوں کی رہگذر تھا۔ اُس زمانے میں ریل قادیان تک نہیں جاتی تھی۔ وہاں تک جانے کے لئے بٹالہ آخری ریلوے اسٹیشن تھا اور اس سے آگے قادیان کی سات آٹھ میل کی مسافت اکّوں پر طے کرنی پڑتی تھی۔ ان حالات میں قادیانی سلسلہ سے متعلق لوگوں کو لامحالہ بٹالہ میں سے گزرنا پڑتا تھا، اور ان کی یہ آمد و رفت بٹالہ کے مسلمانوں کی اس تحریک سے دلچسپی کو بیدار رکھتی تھی۔ اسی دلچسپی کی بنا پر ہم نوجوانوں نے وہاں ایک انجمن قائم کی جس کا نام "انجمن شباب المسلمین" تھا۔ اس انجمن کے زیرِ اہتمام قادیانیوں کے خلاف (قریب قریب) سال بھر اجتماعات منعقد ہوتے رہتے تھے، حتےٰ کہ خود قادیان میں بھی ان جلسوں کا انعقاد عمل میں آتا تھا۔ ان جلسوں میں ہندوستان بھر کے جید علماء و مناظر (بالخصوص علمائے دیوبند) شرکت کرتے تھے۔ (مولانا) سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی شہرت کا آغاز انہی اجتماعات سے ہوا تھا۔

ویسے تو مناظرے، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے بہت کم قولِ فیصل ثابت ہوتے ہیں، لیکن قادیانیوں کے ساتھ مناظروں میں، میں نے دیکھا کہ دشواری اس سے پیش آتی تھی کہ بحث کا مدار روایات پر ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اگر ایک حدیث اِدھر سے پیش ہوتی تھی تو اس کے مقابل میں، دو حدیثیں اُدھر سے پیش ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد بحث اصل موضوع سے ہٹ کر اس نقطہ کے گرد گردش کرنے لگ جاتی تھی کہ ان میں سے کون سی حدیث صحیح ہے اور کونسی ضعیف۔ سارا مناظرہ اسی بحث کی نذر ہو جاتا تھا۔

میں نے دوسرا مسلک اختیار کیا۔ میں اصولِ بحث یہ پیش کیا کرتا تھا کہ فریقین کے درمیان سند اور حجت قرآن کریم ہوگا۔ اور جو حدیث، یا اسلاف میں سے کسی کا قول، تائیداً یا تردیداً پیش کیا جائے گا، اس کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار یہ ہوگا کہ وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ کوئی نیا اصول نہیں تھا، خود ہمارے ہاں، احادیث کے پرکھنے کے جو معیار اسلاف نے مقرر کئے ہیں، ان میں سرِفہرست یہ اصول درج ہے کہ وہ حدیث، قرآن کے خلاف نہیں ہونی چاہیئے۔ فرق یہ تھا کہ ہمارے ہاں کہا یہ جاتا ہے کہ اس معیار کے مطابق احادیث سب پرکھی جا چکی ہیں اور جو کچھ کتب روایات میں آگیا ہے اس پر مزید تنقید و تحقیق نہیں کی جا سکتی۔ میں فریقِ ثانی سے یہ کہتا تھا کہ جو کچھ خارج از قرآن پیش کیا جائے گا، اُسے ہم خود قرآن کی روشنی میں پرکھیں گے اور اگر وہ اس کے مطابق نہیں ہوگا تو اسے سند تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ قادیانی حضرات یا تو اس اصولِ بحث کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے؛ اور اگر آمادہ ہو جاتے تھے تو اپنے دلائل میں چار قدم تک بھی آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ لاجواب ہو جاتے تھے۔

اس مسلک کی اصابت تو اُسی زمانہ میں واضح ہو گئی تھی لیکن اس کی مزید تائید ذرا آگے چل کر ایک ایسے واقعہ سے ہوئی جو مسئلہ قادیانیت کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے (سابق ریاست) بہاولپور کی ایک عدالت میں، ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند مرزائی ہو جانے کی وجہ سے مرتد ہو گیا ہے اس لئے اُس کے ساتھ اس کے نکاح کی تنسیخ

کردی جائے۔ یہ (غالباً) پہلا مقدمہ تھا جس میں یہ اصولی بحث سامنے آئی تھی کہ ایک شخص مرزائیت کا مسلک اختیار کرنے سے مسلمان رہتا ہے یا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ نے ایسی اہمیت اختیار کرلی کہ یہ (گویا) ان فریقین کے درمیان مقدمہ نہ رہا بلکہ "احمدیوں" اور غیر احمدیوں" کے درمیان موضوع بحث بن گیا۔ اِدھر "غیر احمدیوں" کی طرف سے ہندوستان بھر کے چوٹی کے (مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری دیوبندی علیہ الرحمۃ تک کے پائے کے) علماء پیش ہوتے رہے اور "احمدیوں" کی طرف سے ان کے بڑے بڑے مناظر۔ مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی اور وہ ایک دو نہیں، کامل نو سال تک زیر سماعت رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مقدمہ اس قدر طوالت کیوں پکڑ رہا ہے۔ بالآخر ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو محترم محمد اکبر، ڈسٹرکٹ جج ضلع بہاولنگر نے اس کا فیصلہ سنا دیا، جس میں اس راز سے بھی پردہ اٹھ گیا کہ انہیں فیصلہ تک پہنچنے میں کیا الجھن پیش آرہی تھی۔ اس مقدمہ کا فیصلہ اس زمانے میں بھی کتابی شکل میں شائع ہو گیا تھا اور اس کے بعد بھی شائع ہوتا رہا۔ اس وقت میرے سامنے اس کا وہ ایڈیشن ہے جسے سیالکوٹ کی محفل ارشادیہ نے جون ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا۔ اس فیصلہ میں فاضل جج نے لکھا تھا کہ جس نکتہ پر فیصلہ کا مدار تھا وہ یہ تھا کہ مقام نبوت کیا ہوتا ہے اور نبی کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے۔ یہ نکتہ حل نہیں ہو رہا تھا کیونکہ نبی کی کوئی قابل اطمینان تعریف پیش نہیں کی جارہی تھی۔ اس دشواری کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد انہوں نے لکھا کہ:-

> آخر کار ایک رسالہ میں ایک مضمون، بعنوان — میکانکی اسلام — از جناب چوہدری غلام احمد پرویز، میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آجکل کے "روشن ضمیر" طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے، میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جاسکتی۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس پر انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں ان کے الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔ (فیصلہ صفحہ ۱)

ازاں بعد انہوں نے میرے مضمون کے اقتباسات نقل کئے، اور آخر میں یہ فیصلہ سنا دیا کہ رسول اللہؐ کے بعد مدعی نبوت، دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اور جو اس مدعی کو سچا جانے وہ مرتد۔ اس بنا پر انہوں نے مدعیہ کا نکاح، مدعا علیہ سے منسوخ قرار دے دیا۔ اس فیصلہ نے ملک میں دھوم مچا دی تھی۔

جو علماء کرام مسلمانوں کی طرف سے مقدمہ میں پیش ہوتے رہے، ان کے علم و فضل کا مجھے اعتراف تھا اور ان کا میرے دل میں بے حد احترام۔ لیکن اس کے باوجود، جو نکتہ ان کی نو سالہ بحث کے باوجود حل نہ ہو سکا، اور میرے ایک مضمون کے اقتباسات نے اسے حل کر دیا اس کی وجہ وہی تھی جسے میں اوپر بیان کر چکا ہوں — یعنی فریقین میں نو سال تک بحث، روایات کی بنیادوں پر چلتی رہی اس لئے وہ کسی فیصلہ تک نہ پہنچ سکی۔ میں نے مقام نبوت کی تشریح قرآن کریم کی روشنی میں کی تھی، اس لئے چند صفحات میں بات ایسی واضح ہو گئی کہ فاضل جج کو فیصلہ تک پہنچنے میں کوئی الجھن نہ رہی — واضح رہے کہ میرا وہ مضمون، براہ راست مسئلہ ختم نبوت

سے متعلق نہیں تھا۔ اس میں مقام نبوت کی بات ضمناً آگئی تھی جس میں میں نے دورِ حاضر کے مغرب زدہ ذہنوں کو سمجھایا تھا کہ ان کے تصور کے ریفارمر اور نبی میں فرق کیا ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں ختم نبوت کے موضوع پر مختلف اوقات میں مقالات لکھتا رہا اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ (معراجِ انسانیت) کے آخری باب میں اس پر سیر حاصل بحث بھی کی۔ بایں ہمہ مجھ سے یہ تقاضا ہوتا رہا، اور میں نے خود بھی اسے محسوس کیا کہ اس موضوع پر مجھے ایک مستقل تصنیف شائع کرنی چاہیئے۔

طلوع اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۳ء میں جب میں نے احباب کی خدمت میں اپنی مایہ ناز کتاب "شاہکار رسالت" پیش کی تو ختم نبوت سے متعلق کتاب کے تقاضا کو پھر دہرایا گیا اور میں نے وعدہ کیا کہ آئندہ کنونشن پر احباب کے لئے میرا وہی تحفہ ہوگا۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں میں نے اس کتاب کو مرتب اور مکمل کر لیا۔ ارادہ تھا کہ اسے اپنے ذوق کے مطابق نہایت خوبصورت انداز سے آہستہ آہستہ چھپواؤں گا اور کنونشن میں احباب کی خدمت میں پیش کروں گا کہ اتنے میں ربوہ کا حادثہ رونما ہوگیا جس سے اس مسئلہ نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ اور احباب کی طرف سے تقاضے موصول ہونے شروع ہوگئے کہ اس (موعودہ) کتاب کو جلد شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ بہ عجلت تمام اس کی کتابت کرائی گئی اور کاپیاں پریس میں بھیج دی گئیں کہ حکومت کی طرف سے احکام صادر ہوگئے کہ "احمدیوں" کے متعلق کسی قسم کا لٹریچر طبع یا شائع نہیں کیا جا سکتا۔ بادلِ ناخواستہ کتاب کی طباعت روک دینی پڑی۔ سردست وہ پابندیاں ۳۰ ستمبر تک ہیں۔ اس کے بعد انہیں اٹھا لیا گیا تو کتاب بلا مزید تاخیر شائع کر دی جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ "احمدی" حضرات مسلمان ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ آئین اور قانون کی رو سے ہوگیا ہے، لیکن، بایں ہمہ، اس کتاب کی اہمیت بدستور باقی ہے۔ اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ نبی کہتے کسے ہیں۔ مقامِ نبوت ہوتا کیا ہے۔ ختم نبوت سے مراد کیا ہے۔ خدا سے ہمکلامی کے معنی کیا ہیں۔ اور رسول اللہ کے بعد اس کا مدعی کس طرح دائرہ اسلام سے خارج اور ایک جدید (خلافِ اسلام) مذہب کا داعی ہوتا ہے۔ ان اصولی مباحث کے بعد اس میں بتایا گیا ہے کہ "مرزا صاحب" کے دعاوی کیا تھے اور ان کی بنا پر وہ کس طرح دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی، اس امر کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ باب نبوت کے کھولنے کا خیال کہاں سے اور کیسے پیدا ہوا اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کس طرح بند کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام مباحث کی بنیاد قرآن کریم ہے۔

"احمدیوں" کا مسئلہ پارلیمان کی خصوصی کمیٹی کے زیرِ غور قریب تین ماہ تک رہا۔ اس کمیٹی نے اپنی اٹھائیس نشستوں میں، ۹۶ گھنٹوں تک اس پر بحث کی۔ جماعت ربوہ کے سربراہ، مرزا ناصر احمد کی شہادت اور اس پر جرح گیارہ دن تک جاری رہی اور اس پر قریب (۲۰) گھنٹے صرف ہوئے۔ وہاں یہ طولانی عمل جاری تھا اور مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اگر میری کتاب شائع ہو چکی ہوتی اور اس میں پیش کردہ اصول کو تسلیم کر لیا جاتا تو بحث کو نتیجہ تک پہنچنے میں ایک دن سے بھی زیادہ نہ لگتا جس طرح بہاولنگر کے فاضل جج کو حقیقت تک پہنچنے میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ کتاب آپ کے سامنے آئے گی تو آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ بات بالکل صاف ہے۔ الجھنیں سب ہماری پیدا کردہ ہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف

رنگ، جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے!

پارلیمان نے جو آئینی ترامیم منظور کی ہیں' وہ انگریزی زبان میں (پاکستان ٹائمز کی ۸ ستمبر کی اشاعت میں) ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

(۱) جو شخص اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا کہ نبوت' سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی آخری کڑی محمدؐ (رسول اللہ) کی ذات اقدس پر مطلقاً اور غیر مشروط طور پر ختم ہو گئی۔ یا جو شخص رسول اللہ کے بعد نبی ہونیکا دعویٰ کرتا ہے خواہ وہ اس لفظ کو کوئی معنی پہنائے یا کسی رنگ میں مدعی نبوت ہو

وہ' اور جو شخص ایسے مدعی نبوت کو نبی یا مذہبی ریفارمر (مصلح) مانے' آئین اور قانون کی رو سے مسلمان نہیں۔

(۲) آئین کی دفعہ (۳) ۱۰۶ میں غیر مسلم اقلیتوں کی جو فہرست دی گئی ہے' اس میں (ہندوؤں' سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں' وغیرہ کے بعد) ان الفاظ کا اضافہ کیا جائے:۔

جو لوگ قادیانی یا لاہوری گروہ سے متعلق ہوں (جو اپنے آپ کو "احمدی" کہتے ہیں)

یعنی انہیں بھی، دیگر غیر مسلموں کی طرح، غیر مسلم اقلیت تسلیم کیا جائے گا۔

(۳) پارلیمان کی خصوصی کمیٹی نے جو سفارشات کی تھیں' ان میں سے دو کو تو مندرجہ بالا آئینی ترامیم کی شکل میں منظور کر دیا گیا۔ باقی سفارشات حسب ذیل ہیں۔

(۱) تعزیرات پاکستان میں حسب ذیل شق کا اضافہ کیا جائے۔

ختم نبوت کے متعلق آئین میں جو ترمیم کی گئی ہے جو مسلمان' زبان یا عمل سے اس کے خلاف کچھ لیے یا کرے' یا اس کی اشاعت کرے' وہ سزا کا مستوجب ہو گا۔

(ب) آئین کی اس ترمیم کے مطابق، نیشنل رجسٹریشن ایکٹ ۱۹۷۳ء اور انتخابی فہرستوں سے متعلق قواعد مجریہ ۱۹۷۴ء میں مناسب تبدیلی کی جائے (تاکہ "احمدیوں" کو غیر مسلم شمار کیا جا سکے)۔ اور

(ج) یہ کہ' پاکستان کے تمام باشندوں کی جان، آزادی، جائیداد، عزت و آبرو، اور بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا خواہ ان کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو۔

قانونی موشگافیوں کا تو میں ماہر نہیں' آئین میں جو ترامیم کی گئی ہیں' میرے نزدیک ان کے الفاظ خاصے جامع اور جامع ہیں جن کی روشنی میں' قادیانی اور لاہوری' دونوں جماعتوں کے افراد کے غیر مسلم قرار پا جانے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اور یہی اس ساری تگ و تاز کا مقصود تھا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حکومت کے اس اصولی فیصلہ کے عواقب میں جس نے قانون کی حیثیت اختیار کر لی ہے' بہت سے عملی

سوالات پیدا ہوں گے جنہیں بڑے گہرے غور و تدبر کے ساتھ حل کرنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں۔ آپ ذرا اس پر غور کیجئے کہ دنیا کی کسی مملکت میں یہ قانون رائج نہیں کہ کسی کے مذہب کا فیصلہ مملکت کرے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ وہ عیسائی ہے تو مملکت اسے عیسائی تسلیم کر لیتی ہے۔ کوئی اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے تو مملکت اسے مسلمان سمجھ لیتی ہے۔ لیکن مملکت پاکستان نے اس مسلمہ اصول میں تبدیلی کی ہے۔ اب یہاں اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے گا تو مملکت محض اس کے اس قول کی بنا پر اسے مسلمان تسلیم نہیں کرے گی۔ اس نے مسلم اور غیر مسلم میں تفریق کرنے کے لئے جو قانون وضع کیا ہے، وہ اس کی روشنی میں اس شخص کے اس بیان کو پرکھے گی اور اگر وہ اس پر پورا اترا تو اسے مسلمان تسلیم کرے گی، ورنہ غیر مسلم قرار دے گی۔

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ پاکستان میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ بستے تھے جو مسلمان ہونے کے مدعی تھے۔ اور مملکت نے انہیں اب تسلیم کر رکھا تھا۔ اب، مملکت نے آئینی طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ تاریخ کا ایک منفرد واقعہ ہے جس کے ضمن میں بیسیوں عملی سوالات پیدا ہوں گے۔ انہیں رفتہ رفتہ حل کرنا ہوگا اور نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ۔ عجلت میں کئے گئے فیصلوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اس کی ایک مثال تو اسی وقت ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ پارلیمان کی خصوصی کمیٹی نے ایک سفارش یہ بھی کی ہے کہ "جو مسلمان ختم نبوت کے خلاف قولاً یا فعلاً کچھ کرے گا یا اس کی اشاعت کرے گا وہ سزا کا مستوجب ہوگا"۔ ایسا کہتے وقت ان سینکڑوں ارکان کمیٹی میں سے کسی نے اتنا نہیں سوچا کہ جو شخص ختم نبوت کے خلاف کچھ کہے گا وہ اس حد بد فیصلہ کی رُو سے مسلمان رہے گا ہی نہیں۔ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ جو مسلمان ختم نبوت کے خلاف کچھ کہے گا وہ سزا کا مستوجب ہوگا، عجیب بے تکی بات ہے۔

پھر اس کہنے سے کہ جو مسلمان ختم نبوت کے خلاف کچھ کہے گا، وہ سزا کا مستوجب ہوگا، آپ نے غیر مسلموں کو اس سے خود بخود مستثنیٰ قرار دے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "احمدی" حضرات کو کھلی چھٹی ہوگی کہ وہ ختم نبوت کے خلاف جو جی میں آئے کہتے رہیں، ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا کیونکہ مواخذہ صرف مسلمانوں سے ہوگا، اور "احمدیوں" کو آپ نے غیر مسلم قرار دے دیا ہے۔ وہ اس مجوزہ قانون کی زد میں آئیں گے ہی نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ جو فیصلے عجلت سے کئے جائیں، ان میں کس طرح سقم رہ جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، آئین پاکستان کی اس ترمیم کے عواقب میں بہت سے عملی سوالات پیدا ہوں گے جن کا اطمینان سے حل سوچنا ہوگا۔ میں ابھی ان نکات پر فوری گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں طلوع اسلام کنونشن منعقد ہو رہی ہے، ان نکات کو میں کنونشن پر اٹھا رکھنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

سردست، میں نے پارلیمان اور حکومت کے اس فیصلہ پر، اپنی طرف سے اور ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے جس کا میں سربراہ ہوں، اور قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے، جس کا میں صدر ہوں، محترم وزیر اعظم، وفاقی وزیر قانون، محترم عبدالحفیظ پیرزادہ، اور نیشنل اسمبلی کے نقیب (سپیکر) محترم صاحبزادہ فاروق علی صاحب

کی خدمت میں حسب ذیل مفہوم کے تار ارسال کئے ہیں۔

آپ کی حکومت نے "احمدیوں" کو جو غیر مسلم قرار دیا ہے، اس پر میں اپنی طرف سے بھی اور ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے جس کا میں سربراہ ہوں، نیز قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے جس کا میں صدر ہوں، دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مسلم اور غیر مسلم میں قانونی تفریق مسلمانوں کی تاریخ میں ایک منفرد نظیر ہے جسے آپ نے قائم کیا ہے۔ آپ کا یہ اقدام قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے جو "مذہب اور ریاست" کی ثنویت قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔ مملکتِ پاکستان کو فی الحقیقت اسلامی مملکت بنانے کی سمت میں یہ بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے۔ خدا آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔

باقی رہا، بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکرانہ اور حضورِ رسالتمآبؐ میں نذرانۂ عقیدت، سو وہ میرے روز و شب کی پکار، زندگی کا سہارا اور آخرت کا توشہ ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

(۰)

جہاں تک "احمدی" حضرات کا تعلق ہے، انہوں نے غیر مسلم اقلیت بن کر کچھ کھویا نہیں، بلکہ مزید کچھ پایا ہی ہے۔ مروجہ آئینِ پاکستان کی رو سے، پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں صرف ایک بات میں تفریق کی گئی ہے اور وہ یہ کہ کوئی غیر مسلم، مملکت کا صدر یا وزیر اعظم نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ان دو مناصب کا تعلق ہے، وہ ("احمدی") اس ترمیم کے بغیر بھی، ان کے آرزو مند کبھی نہیں ہو سکتے تھے۔ ان دو مناصب کے سوا کسی معاملہ میں بھی مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تفریق و تمیز نہیں کی گئی (قرآن کی رو سے یہ چیز ایک اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے، لیکن بہرحال موجودہ صورت یہی ہے) ۔ نہ ملازمتوں کے معاملہ میں، نہ رائے دہندگی کے معاملہ میں۔ نہ مجالسِ قوانین ساز (پارلیمان وغیرہ) کی رکنیت کے لئے امیدوار ہونے کے معاملہ میں۔ (ہمارے ہاں تو انتخابات بھی جداگانہ نہیں مخلوط ہیں)۔ نہ حقوقِ شہریت کے معاملہ میں۔ نہ بنیادی حقوق کے معاملہ میں۔

اور جو کچھ انہیں مزید حاصل ہوا ہے، وہ یہ کہ صوبائی اسمبلیوں میں جو نشستیں غیر مسلم اقلیتوں کے لئے مختص ہیں، وہ انہیں حاصل کرنے کے حقدار ہو گئے ہیں، اور ان اقلیتوں کو تحفظات کی جو ضمانت دی گئی ہے، اس کے حصول کے قانونی مستحق۔ باقی رہا یہ کہ انہیں ملتِ اسلامیہ سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے، اور یہ چیز کچھ کم صدمہ کا باعث نہیں، سو اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ کسی مسلمان کا اپنی ملت سے کٹ جانا، موت سے بھی زیادہ صدمہ کا موجب ہے ۔۔ ملت سے کٹ جانا تو ایک طرف، ملت کی طرف سے اس کا وقتی اور ہنگامی مقاطعہ (جیسا کہ حضورؐ کے وقت، جنگ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے صحابہؓ کے ساتھ ہوا تھا) وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جسے قرآن مجید نے ان جگر پاش الفاظ میں بیان کیا ہے کہ۔ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ۔ (۹/۱۱۸)

"زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی تھی کہ وہ خود اپنی جان سے تنگ آگئے"۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ اس ملت سے وابستہ کب تھے جو انہیں اس سے کٹ جانے کا صدمہ ہو! (جب میری کتاب سامنے آئے گی تو آپ اس میں دیکھیں گے کہ) انہوں نے کبھی اپنے آپ کو ملت اسلامیہ کے افراد نہیں سمجھا ہے۔ وہ اس ملت کو "اسلامیہ" سمجھتے ہی نہیں۔ ملت کا فرد سمجھتے ہیں، اور اس سے علیحدگی میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ پھر اس سے کٹ جانے میں انہیں صدمہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف اتنا ہی ہوا ہے کہ یہ جو دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا رکھا گیا تھا کہ یہ ملت اسلامیہ کا جزو ہیں (اور اس طرح کچھ مفادات حاصل کر لیتے تھے)، وہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ اور اسے ایک دن دور ہونا ہی تھا۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اقبالؒ نے (۱۹۳۵ء) میں آواز اٹھائی تھی۔ قوم کی تغافل شعاری اور روباہ بازی، سادگی و پرکاری کی وجہ سے اس میں چالیس سال لگ گئے۔ (اور اگر اس کا شمار اس تحریک کے آغاز سے کیا جائے تو قریب نوّے (۹۰) سال کا عرصہ) انہیں اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ ان لوگوں کی اسی ابلہ فریبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ بہائی تحریک، تحریک احمدیت سے کہیں زیادہ دیانتدار ہے کہ جو کچھ وہ ہیں اس کا کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں!

(۰)

میرے لئے یہ فیصلہ ایک اور جہت سے بھی باعث صد اطمینان و تشکر ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۔ (۹/۳۳) "خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت، اور حق پر مبنی نظام (دین) دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام انسانوں کے وضع کردہ تمام نظامہائے حیات پر غالب آجائے۔ خواہ مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے"۔ اس نظام کے، انسانوں کے وضع کردہ نظاموں پر غالب آنے کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک جماعت، اس نظام کی صداقت پر یقین محکم رکھتی ہوئی اُٹھے اور اسے عملاً نافذ کر دے اور اس کے درخشندہ، انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر دنیا کشاں کشاں، فوج در فوج اس کی طرف آتی جائے (۱۱۰/۲) اور دوسرا طریق یہ ہے کہ انسان مختلف نظاموں کو آزماتا ہوا اس مقام پر پہنچ جائے جہاں یہ نظام ناکام ثابت ہو جائیں، اور اس کے بعد اس کے لئے، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے کہ وہ نظام خداوندی کو اختیار کرے۔ عام الفاظ میں اسے "زمانے کے تقاضے" کہا جاتا ہے۔

نزول قرآن سے پہلے، مختلف اقوام و ممالک کے نظام سیاست کی بنیادی شق یہ تھی کہ اس میں، مذہبی پیشوا (PRIESTS) خدا کے نام پر لوگوں سے اپنی اطاعت کراتے تھے۔ اس کی ایک شکل تو تھیاکریسی تھی جس میں اقتدار کلیۃً مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور سربراہ مملکت کی حیثیت کٹھ پتلی یا علامتی پیکر سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی تھی۔ اس کی دوسری شکل یہ تھی کہ مذہب اور سیاست کے الگ الگ دائرے تھے۔ سیاست کے دائرہ میں حکمرانی مملکت کی ہوتی تھی اور مذہب کے دائرہ میں مذہبی پیشوائیت کی۔ اسے مذہب اور سیاست میں ثنویت (DUALISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن نے آکر اعلان کیا کہ یہ دونوں نظام باطل ہیں۔ حکمرانی قوانینِ خداوندی کی ہوگی جن کا نفاذ مملکت کے ذریعے ہوگا۔ اس طرح اس نے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر دیا اور یہ چیز دنیائے انسانیت کے لئے رحمت کبریٰ تھی۔ مذہبی پیشوائیت خدا کے نام پر جو ظلم اور استبداد روا رکھتی تھی اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں آپ کو مذہبی پیشواؤں کا نام تک دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے بعد "خلافت" ملوکیت میں بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت نے پھر سر ابھارا اور ثنویت کا نظام قائم ہو گیا جس میں اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین مذہبی پیشواؤں کے حیطۂ اقتدار میں دے دیئے گئے اور دنیاوی امور سلطنت کے پاس رہے۔ ہندوستان میں یہی نظام انگریزوں کی عملداری تک قائم رہا۔ اس کے آخری دور میں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے لئے الگ آزاد مملکت کا تصور پیش کیا۔ تاکہ اس میں خلافت علیٰ منہاج نبوت کے نقوشِ قدم پر اسلامی نظامِ حکومت رائج کیا جا سکے۔ مملکت کا یہ تصور ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے قابلِ قبول نہ تھا کیونکہ اس میں ان کے اقتدار کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ ہندوؤں نے وہاں کے (نیشنلسٹ) علماء کو ثنویت کا وعدہ دے دیا۔ اس لئے انہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک اور تحریک ابھری جس کے پیشِ نظر پاکستان میں تھیاکریسی قائم کرنا تھا۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی قیادت میں یہ کہہ کر کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے کہ یہ مغرب زدہ لیڈر اسلام کی ابجد تک سے واقف نہیں۔ ان کے کردار میں اسلامیت کی چھینٹ تک دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے ہاتھوں جو مملکت قائم ہوگی وہ اسلامی مملکت نہیں مسلمانوں کی کافرانہ مملکت ہوگی۔ اسلامی مملکت ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو سکے گی جو اسلام کا علم رکھتے ہیں، جو اقامتِ دین کے داعی ہیں ــــ یہ "جماعتِ اسلامی" تھی جس کی بنا ۱۹۴۱ء میں ڈالی گئی تھی۔ اس جماعت کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک طرف تحریکِ پاکستان کی قیادت کو بدنام کرنا شروع کیا اور دوسری طرف اپنی جماعت کو اس مقصد کے لئے تیار کرنا کہ اقتدار حاصل کرنا ان کا دینی فریضہ ہے، خواہ یہ پُرامن طریق سے ممکن ہو اور خواہ قوت کے ذریعے۔ وہ اپنی جماعت کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ:

> اصلاحِ خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔ جو کوئی حقیقت میں خدا کی زمین سے فتنہ فساد مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلقِ خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح ہو کر کام کرنا فضول ہے، اس کے لئے اُسے اٹھنا چاہیئے اور غلط اصول کی حکومت کا خاتمہ کر کے غلط کار لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر، صحیح اصول اور صحیح طریقہ کی حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ (خطبات - ص ۲۳۱)

اور یہ کہ:-

> اسلام کی نگاہ میں یہ بات ہرگز کافی نہیں ہے کہ تم نے خدا کو... اور اس کے قانون کو برحق مان لیا۔ نہیں! اس کو ماننے کے ساتھ ہی آپ سے آپ یہ فرض عاید ہو جاتا

> ہے کہ جہاں بھی تم ہو جس سرزمین میں تمہاری حکومت ہو، وہاں خلقِ خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو۔ حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرماں روائی کا اقتدار چھین لو اور بندگانِ خدا کی سربراہ کاری اپنے ہاتھ میں لے کر خدا کے قانون کے مطابق آخرت کی ذمہ داری اور خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین رکھتے ہوئے حکومت کے معاملات سرانجام دو۔ اس جد وجہد کا نام جہاد ہے۔　　　(خطبات صـ۲۳۴)

مودودی صاحب کے ساتھ میرے تعلقات کتنے دیرینہ تھے اور میں ان کے مقاصد و عزائم سے کس قدر واقف تھا، میں اس کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اسے ذاتیات میں الجھنا سمجھا جائے گا۔ اور ذاتیات میں الجھنا میرے مسلک کے خلاف ہے۔ میں اس گفتگو کو اصولی حدود تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ قرآن کے ایک ادنیٰ طالبِ علم ہونے کی حیثیت سے مجھ پر یہ فریضہ عاید ہوتا تھا کہ میں اُس تحریک کی حمایت کروں جس کا مقصد ایک ایسی مملکت کا حصول تھا جس میں صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے، اور ہر اُس تحریک اور اقدام کی مخالفت کروں جو اس کے راستے میں حائل ہو۔ اس مقصد کے لئے طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں لایا گیا جس نے ان لوگوں کے خلاف قرآن عزائم کی بھرپور مخالفت کی۔

پاکستان وجود میں آگیا اور اُس کے ساتھ ہی نیشنلسٹ علماء۔ اور ان کے متبعین اور جماعتِ اسلامی، ادھر منتقل ہو کر آگئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنے عزائم کی تکمیل اور مقاصد کے حصول کے لئے اور شدت سے جد وجہد شروع کر دی۔ نیشنلسٹ علماء کے پیشِ نظر ثنویت کا نظام ہے اور جماعتِ اسلامی کا منتہائے مقصود تھیاکریسی، لیکن جب تک وہ حاصل نہ ہو، وہ بھی ثنویت کے مؤید رہتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہتا ہے خواہ وہ محدود دائرے کے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ وقت نہیں (اور نہ ہی یہ بات میرے پیشِ نظر موضوع سے براہِ راست متعلق ہے) ورنہ میں بتاتا کہ پاکستان میں گزشتہ چھبیس چھبیس سال سے جو کچھ اسلام کے نام سے کیا جا رہا ہے وہ اسی مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اسلامی آئین و ضوابط کے لئے جو مطالبہ پیش کیا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ یہ کہ

(۱) شخصی قوانین (پرسنل لاز) ہر فرقہ کے اپنے اپنے ہوں۔ اور

(۲) پبلک لاز، کتاب و سنت کے مطابق حکومت وضع کرے۔

پرسنل لاز اور پبلک لاز میں یہ تفریق ہی تو ثنویت ہے جس میں پرسنل لاز کے دائرے میں حکمرانی مذہبی پیشوائیت کی ہوتی ہے اور پبلک لاز میں، مملکت کی۔ مملکت کو اس کا حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مذہبی پیشوائیت کے دائرہ اقتدار میں قدم بھی رکھ سکے۔ اسے ایک عملی مثال سے سمجھئے۔ ملک میں زنا عام ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ حکومت کی طرف سے اس کے لئے لائسنس جاری ہوتے ہیں۔ آپ نے آج تک نہیں دیکھا ہوگا کہ ان حضرات کی طرف سے اس کے خلاف کوئی محاذ قائم ہوا ہو۔ لیکن جب حکومت

نے عائلی قوانین (F A M I L Y L A W S) نافذ کئے تو ملک میں طوفان برپا کر دیا گیا ۔ یہ کیوں ؟ اس لئے کہ عائلی قوانین مذہبی پیشوائیت کے دائرہ اقتدار میں آتے ہیں، لہٰذا یہ حضرات، حکومت کو اجازت ہی نہیں دے سکتے کہ وہ اس دائرہ میں مداخلت کرے ۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ :

> عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد، اگر کوئی شخص شریعت کے مطابق کسی قسم کی طلاق دے دے تو وہ واقع ہو جائے گی ۔ متذکرہ صدر قوانین کی رُو سے تو طلاق کے نافذ کرنے کے لئے کچھ خاص شرائط عاید کر دی گئی ہیں ۔

مودودی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا ۔

> کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائم مقام بن سکتے ہیں ۔ اس لئے جو طلاق شرعی قواعد کی رو سے دے دی گئی ہو وہ عنداللہ اور عندالمسلمین نافذ ہو جائے گی خواہ ان قوانین کی رو سے وہ نافذ نہ ہو ۔ اور جو طلاق شرعاً قابلِ نفاذ نہیں وہ ہرگز نافذ نہ ہو گی خواہ یہ قوانین اس کو نافذ کر دیں ۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیئے کہ وہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات خدا اور رسول کی شریعت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں یا ان عائلی قوانین کے مطابق ۔
>
> (ترجمان القرآن ۔ مئی ستمبر ۱۹۶۲ء)

جسے انہوں نے "قانونِ شریعت" کہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ہر فرقہ کا الگ الگ ہے اور ایک فرقہ کے قانون کی رو سے دی گئی طلاق کو دوسرا فرقہ جائز تسلیم نہیں کرتا ۔ لیکن اس کے خلاف انہیں کوئی اعتراض نہیں (تھا اور نہ ہی کوئی اعتراض ہوتا ہے) اعتراض اس پر تھا کہ حکومت نے اس معاملہ کے متعلق قوانین کیوں نافذ کئے ہیں، جو مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اقتدار میں آتا ہے ۔ حکومت ہمارے دائرۂ اقتدار میں مداخلت کرنے کا کیا حق رکھتی ہے ؟

اب رہا پبلک لاز کا معاملہ جسے حکومت کی تحویل میں دیا گیا ہے تو اس کے لئے ایک عجیب و غریب اور کچدار دور رس نتائج کا نسخہ تجویز کیا گیا ہے ۔ مطالبہ یہ ہے کہ کوئی قانون، کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہو گا ۔ اس مطالبہ پر گذشتہ بیس پچیس سال سے مسلسل زور دیا جا رہا ہے حتیٰ کہ اسے آئین کے اندر داخل کرا لیا گیا ہے ۔ بظاہر یہ مطالبہ بڑا معقول نظر آتا ہے ۔ لیکن اس کے عملی پہلو کی طرف آیئے تو خود مودودی صاحب کو اعتراف ہے کہ :

> کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ضابطہ ایسا مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے ۔
>
> (ایضاً ۔ صفحہ ۲۳)

اس اعتراف کی روشنی میں سوچیے کہ اس مطالبہ اور شرط کا نتیجہ کیا ہو گا (اور ہے)

(۱) پرسنل لاز کے معاملہ میں حکومت مداخلت نہیں کر سکے گی ۔ اور

(۲) پبلک لاز کے سلسلہ میں حکومت جو قانون بھی مرتب کریگی، وہ کسی نہ کسی فرقہ کے مسلک کے خلاف ہوگا اس لئے وہ فرقہ اس کے خلاف سرکشی برتے گا یعنی حکومت کے دائرہ اقتدار کو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے چیلنج کرنے کا امکان ہر وقت موجود رہے گا۔

اس صورتِ حال کا عملی نتیجہ تھیاکریسی نہیں تو اور کیا ہے! یہاں مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی باریکیاں عوام کی ذہنی سطح سے بلند ہیں۔ جہاں تک ملک کے دانش ور طبقہ کا تعلق ہے وہ مذہبی پیشوائیت کے پیش کردہ اسلام اور ان کے تنگ نئے دن کے جھگڑوں سے تنگ آکر مذہب سے بے اعتنا (INDIFFERENT) ہو چکا ہے۔ ایک طلوعِ اسلام ہے جو ان مسائل کو سامنے لا رہا ہے۔ اس کے نزدیک تھیاکریسی ہو یا ثنویت، یہ سب تصورات اسلام کے یکسر خلاف ہیں۔ اس لئے اس کی طرف سے ان کی مخالفت لازمی تھی۔ یہ اسے اپنا قرآنی فریضہ سمجھتا تھا اور سمجھتا ہے اس نے اس کی مخالفت کی اور اپنے امکان بھر پوری قوت سے مخالفت کی۔ اس کا پیش کردہ موقف یہ تھا اور ہے کہ

(۱) اسلامی نظامِ حکومت میں مذہب اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں ہوتی جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس میں تمام کاروبارِ حکومت سرانجام دیتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا اس میں تصور ہی نہیں ہوتا۔

(۲) یہ حکومت امت کی باہمی مشاورت سے قائم ہوتی ہے۔

(۳) قرآن کریم وہ مستقل غیر متبدل حدود مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے یہ حکومت اپنا کاروبار سرانجام دیتی ہے۔ خارج از قرآن جس بات کو بھی اسلام کے نام سے پیش کیا جائے اس کی صحت اور سقم کے لئے قرآن کو معیار قرار دیا جائے گا۔

(۴) کرنے کا کام یہ ہے کہ آئین میں ان حدود کو نہایت وضاحت سے درج کر دیا جائے اور ایسی مشنری وضع کر دی جائے (مثلاً عدالتِ عالیہ وغیرہ) جو اس بات کا فیصلہ کرے کہ حکومت نے کسی معاملہ میں ان حدود سے تجاوز تو نہیں کیا۔ اور اگر یہ تجاوز ثابت ہو جائے اور حکومت اس سے رجوع نہ کرے تو اسے برطرف کیا جا سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظام جس میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو جاتا تھا، ان حضرات کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ کھلے بندوں ایسا کہہ نہیں سکتے تھے کہ وہ نظام جس میں تھیاکریسی یا ثنویت باقی نہ رہے، ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ زمانہ کی آنکھیں اب اس قدر کھل چکی ہیں کہ کوئی صاحب عقل و ہوش مذہبی پیشوائیت کے حقِ اقتدار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ان لوگوں نے ایک اور حربہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اس شخص (پرویز) کو اس قدر بدنام کیا جائے کہ کوئی شخص اس کی بات سننے کے لئے تیار نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے عوام کے نازک جذبات کو مشتعل کرنا بڑا مؤثر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا اور مشہور کرنا شروع کر دیا کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ منکرِ سنتِ رسول اللہ ہے۔ تین نمازیں اور نو دن کے روزے بتاتا ہے اور دو میں نماز پڑھنے کو کہتا ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کر رہا ہے۔ آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کرے گا اس لئے قادیانیت اور پرویزیت

دونوں کا فتنہ ایک جیسا ہے۔

ان الزامات کے سرتاپا جھوٹا اور خود تراشیدہ ہونے کے سلسلہ میں میں اتنا کچھ اور اتنی بار وضاحت کر چکا ہوں کہ اسے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ملخصاً میں ہر اس حدیث کو صحیح مانتا ہوں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہو یا جس سے حضورؐ نبی اکرمؐ یا صحابہؓ کبار کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔ میری مایۂ ناز تصنیف 'معراج انسانیت' اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ میرے نزدیک حضورؐ، شرفِ انسانیت کے اُس معراجِ کبریٰ پر فائز ہیں جس تک کسی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ میں نماز، روزہ اور دیگر ارکانِ اسلام کو اسی طرح ادا کرتا ہوں جس طرح باقی مسلمان ادا کرتے ہیں اور بار بار لکھ چکا ہوں کہ کسی فرد یا جماعت کو اس کا حق نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرے یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے۔ سوچئے کہ اگر یہ اتباعِ سنت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور وہ بھی نماز کی سب سے پہلے میں نے مخالفت کی تھی۔ باقی رہا دعویٰ نبوت، سو جس شخص کے ایک مقالہ کی بنیاد پر، آج سے چالیس سال پہلے، مدعی نبوت اور اُسے ایسا سمجھنے والے عدالت کی رو سے دائرہ اسلام سے خارج قرار پا گئے تھے، اس کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنا، انتہائی بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اب تو ساری دنیا جانتی ہے کہ مدعی نبوت اور اس کے متبعین کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے میں میری تحریروں کو کس قدر دخل حاصل ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ میں نہ منکرِ حدیث ہوں، نہ منکرِ شانِ رسالتؐ۔ میں تھیاکریسی اور ثنویت کا منکر ہوں اور یہی میرا وہ جرم ہے جس کی بنا پر میں ان حضرات کی نگاہ میں قابلِ گردن زدنی قرار پاتا ہوں۔ چونکہ ان کے پاس منظم پراپیگنڈہ کے ذرائع بے حد وحساب ہیں، اس لئے وہ مجھے بدنام کرنے میں کامیاب ہیں۔ میرے پاس ایسے اسباب و ذرائع نہیں۔ لیکن یہ میری آواز کو تو دبا سکتے ہیں، زمانے کے تقاضوں کو تو نہیں دبا سکتے۔ قرآنی نظام کے غالب آنے کے راستے نہیں روک سکتے۔

اور یہیں سے بات آگے چلتی ہے۔

(٥)

مذہبی پیشوائیت کے اظہارِ اقتدار کی شدت، کفر کے فتووں کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ خود ان کے متعدد فرقوں میں سے نہ کوئی فرقہ ایسا ہے جس پر کفر کا فتویٰ نہ لگ چکا ہو اور نہ ہی کوئی ممتاز شخصیت ایسی جو اس ناوک کا شکار نہ ہو چکی ہو۔ میں ان کی خدمت میں گزارش کرتا چلا آرہا تھا کہ کسی کے کفر و اسلام کے فیصلہ کرنے کا حق اور اختیار کسی فرد یا گروہ کو نہیں۔ اس کا حق صرف اسلامی مملکت کو ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کو اس کا حق ہی حاصل نہیں ہوتا اُس کا مملکتی اور آئینی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ مسلم اور غیر مسلم میں تفریق کرے۔ یہ اس لئے کہ اسلامی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم کے حقوق اور ذمہ داریوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس لئے آئینِ مملکت کی رُو سے ضروری ہے کہ مملکت اس تفریق کے لئے واضح خطوط متعین کرے۔ یعنی اس کی وضاحت کرے کہ مملکت کسے مسلمان تسلیم کرے گی اور کسے غیر مسلم، اُسی طرح جس طرح عام مملکتوں کو اس کی وضاحت کرنی ہوتی ہے کہ اس مملکت کا نیشنل کون ہو سکتا ہے اور کون نہیں۔ لیکن ہمارے علماء

حضرات اسے بھی اپنے دائرۂ اقتدار میں مداخلت قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ انہیں اس کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ جسے چاہیں کافر قرار دیدیں۔ میں ان سے کہتا تھا کہ ذرا سوچئے کہ آپ جس شخص یا فرقہ کو کافر قرار دیتے ہیں، اس سے اس کا بگڑتا کیا ہے؟ اس سے اس کی 'فتویٰ' سے قبل اور بعد کی حیثیت میں فرق کیا آتا ہے! آپ قریب سو سال سے "احمدیوں" کو کافر قرار دیتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے اُن کا بگڑا کیا ہے۔ اسکے برعکس، اگر اسلامی مملکت انہیں (یا کسی اور کو) دائرہ اسلام سے خارج قرار دے تو پھر دیکھئے ان کی حیثیت میں کیا فرق پڑتا ہے لیکن یہ بات یا تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور یا وہ اپنے (ذہنی) اقتدار سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے۔

لیکن جب انہوں نے طوعاً ایسا نہ کرنا چاہا تو "زمانہ کے تقاضے" آگے بڑھے اور انہوں نے کرھاً ایسا کرا دیا۔

مذہبی پیشوائیت نے "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے ۱۹۵۳ء میں ایک طریق کار اختیار کیا جو اس قدر ناکام ثابت ہوا کہ بیس سال کا عرصہ گذر گیا لیکن انہوں نے پھر اس کا نام تک نہ لیا۔ ایسی خاموش فضا میں اس فراموش کردہ حقیقت نے خود بخود انگڑائی لی اور ربوہ کا حادثہ وقوع پذیر ہو گیا۔ اس کے بعد ہم کیا دیکھتے ہیں کہ وہی مذہبی پیشوائیت جو اپنے حریم اقتدار میں کسی کو جھانکنے تک نہ دیتی تھی، حکومت سے متفقہ طور پر مطالبہ کر رہی ہے کہ "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ حکومت سے اس مطالبہ کے معنی یہ تھے کہ مذہبی پیشوائیت خود بخود اپنے حق اقتدار سے، بحق حکومت دستبردار ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی جو حکومت کے سپرد کی جا رہی تھی۔ اس نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آئینی طریق اختیار کیا۔ اس تمام دوران میں مذہبی پیشوائیت حکومت پر برابر زور دیتی رہی کہ وہ اس کا فیصلہ جلد کرے یعنی وہ اس امر کا مسلسل اعتراف کرتی رہی کہ اس فیصلہ کی مجاز حکومت ہی ہے۔ یہ اسی کے حیطۂ اقتدار کی چیز ہے ہمارے نہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا تو فطرت کی اس ستم ظریفی پر مسکرا اٹھتا کہ جس بھٹو کو یہ حضرات ابھی کل تک کافر قرار دے رہے تھے، اسی بھٹو سے اب مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ "احمدیوں" کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرے۔ اور بالآخر حکومت نے اس کا فیصلہ کر دیا، اور اس فیصلہ پر انہوں نے حکومت کو مبارک بادیاں دیں اور جشن مسرت منایا۔ دیکھا آپ نے کہ جس حقیقت کو یہ حضرات طوعاً ماننے کے لئے تیار نہ تھے، زمانے کے تقاضوں نے اسے کس طرح کرھاً منوا لیا۔!

پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے جب خود مذہبی پیشوائیت نے تسلیم کر لیا ہے کہ "مذہبی امور میں بھی فیصلہ کا اختیار، حکومت کو ہوتا ہے، مذہبی پیشوائیت کو نہیں۔ یہ بہت بڑا انقلابی قدم ہے جو اس طرح اٹھ گیا ہے اور بہت اہم نظیر (PRECEDENT) ہے جو قائم ہو گئی ہے۔ اس سے مملکت کے اسلامی بننے کا راستہ ہموار ہو گیا ہے۔ اگر اسی قسم کے قدم اور اٹھتے گئے تو توقع کی جا سکتی ہے کہ مملکت رفتہ رفتہ اُس منزل کے قریب ہوتی جائے گی جو پاکستان کا نصب العین تھا، بشرطیکہ یہ قدم قرآن کریم کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اور اس کی عطا کردہ اقدار کے مطابق اٹھیں۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ یہ فیصلہ صرف اِس اعتبار سے درخورِ تحسین و آفرین نہیں کہ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والے غیر مسلموں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ یہ اس لحاظ سے بھی سزاوارِ تہنیت ہے کہ لوگوں کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرنے کا اختیار جہاں ہونا چاہیئے تھا وہاں پہنچ گیا۔ حق بحقدار رسید ۔۔۔ ہمیں امید ہے کہ اب حکومت اس قسم کا قانون بھی نافذ کر دے گی جس کی رُو سے کسی کو کافر قرار دینا جرم قرار پا جائے۔

(٠)

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے اس اصولی فیصلہ سے بہت سے عملی مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا حل نہایت ضروری ہے لیکن وہ حل وقت بھی چاہتا ہے اور گہرے فکر و تدبر کا متقاضی بھی ہے۔ میں ان مسائل پر آئندہ کنونیشن کے موقع پر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ البتہ ایک سوال ایسا ہے جسے بلا تاخیر سامنے لانا ضروری ہے خصوصی کمیٹی کی سفارشات میں کہا گیا ہے کہ نئے سرے سے رجسٹریشن ہونی چاہیئے جس کی رُو سے یہ متعین ہو جائے کہ اس فیصلہ کی زد میں کون کون آتا ہے۔ سردست تو یہی کہا گیا ہے کہ "قادیانی" اور لاہوری" گروہ کے افراد جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں، غیر مسلم اقلیت شمار ہوں گے۔" لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ مرزا صاحب کو نبی یا مذہبی مصلح ماننے والے اپنے آپ کو قادیانی، لاہوری یا احمدی کہیں ہی نہیں۔ اپنے آپ کو متعارف ہی کسی اور نام سے کرائیں! اس کے لئے ضروری ہے کہ رجسٹریشن کے لئے اس قسم کے اقرار نامہ پر دستخط لئے جائیں کہ

میں مرزا غلام احمد قادیانی کو مسلمان نہیں مانتا / مسلمان مانتا ہوں ۔ اس سے بات دو ٹوک ہو جائیگی۔

(٠)

آخر میں چند ایک گذارشات ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) پہلی گذارش علماء حضرات کی خدمت میں ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ ثنویت یا تھیاکریسی کے تصور کو ذہن سے نکال کر، پاکستان میں "خلافت علیٰ منہاجِ رسالت" کے قیام کی کوشش کریں جس میں تمام امور (بلا تخصیص "مذہب و سیاست") کے فیصلے نمائندگانِ ملت کے مشورہ سے، خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کئے جاتے ہیں۔ انہی فیصلوں کا نام قوانینِ شریعت ہوتا ہے جنہیں مملکت نافذ کرتی ہے۔ ان قوانین کی اطاعت تمام مسلمانوں پر لازم ہوتی ہے، اس لئے اس سے تمام اختلافات مٹ کر امت میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ خلافتِ راشدہ میں خدا کی حکمرانی اور اتباعِ سنت رسول اللہ کا عملی مفہوم یہی تھا اور اسی کی میں پہلے دن سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہوں۔

(۲) میری دوسری گذارش اربابِ حکومت کی خدمت میں ہے اور وہ یہ کہ جب آپ نے کفر و اسلام جیسے بنیادی سوال کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے تو مملکت کو اسلامی بنانے کے لئے بتدریج قدم اٹھاتے جایئے۔ اور اس کا اصول یہ ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ بھی کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ۔ وہ کافر ہیں۔

یعنی حکومت یا مملکت کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے اختیارات کا استعمال کتاب اللہ کے مطابق کرتی ہے یا نہیں۔ اور

(۳) میری تیسری گذارش عوام سے ہے۔ اور وہ یہ کہ حکومت کے اس فیصلہ کی رُو سے، "احمدیوں" کی پوزیشن دوسرے غیر مسلموں ــــ ہندو، عیسائی، سکھ، پارسی ــــ کی سی ہو گئی ہے۔ ان کے ساتھ بھی آپ اُسی حسنِ سلوک کا ثبوت دیں جو حسنِ سلوک آپ دیگر غیر مسلموں سے روا رکھتے چلے آئے ہیں۔ اور جو اسلام کا تقاضا ہے۔

آخر میں' میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے مبارک باد کے پیغامات بھیجے ہیں ــ مبارکباد کی مستحق درحقیقت' بہ حیثیتِ مجموعی' تمام ملتِ پاکستانیہ ہے' اور مجاز سے آگے گذر کر ــ بارگاہِ خداوندی۔

والسلام! پرویز

(❊)

پابندیوں کا نتیجہ

گذشتہ جولائی ۱۹۸۴ء میں حکومت پنجاب کی طرف سے احکام جاری ہوئے کہ کسی قسم کا فرقہ وارانہ لٹریچر نہ طبع کیا جا سکتا ہے نہ شائع۔ اس سے بالخصوص "احمدیوں" کے خلاف لٹریچر کی اشاعت پر پابندی مقصود تھی تاکہ ملک میں اشتعال انگیز فضا پیدا نہ ہو۔ ان پابندیوں کی مدت بالاقساط بڑھتی گئی اور اب یہ احکام ۳۰ ستمبر تک نافذ رہیں گے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ اس کے بعد صورت کیا؟ ان پابندیوں کا امن عامہ پر کیا اثر پڑا، اس کے متعلق تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ لیکن ان سے مسئلہ "احمدیت" پر جو مضر اثر مرتب ہوا وہ پہلے سے سامنے ہے۔ اس دوران میں "احمدیوں" نے اپنا بھرپور پراپیگنڈہ جاری رکھا اور ایسا لٹریچر گھر گھر تک پہنچاتے رہے جس میں بتایا گیا کہ مرزا صاحب سچے اور سچے مسلمان تھے اور "احمدیوں" کے عقاید مسلمانوں سے الگ نہیں۔ وہ تو یہ کچھ کرتے رہے (اور کر رہے ہیں) لیکن ان کی تردید میں ایک لفظ نہیں لکھا جا سکتا۔ کیونکہ اس پر پابندی عاید ہے۔ نتیجہ یہ کہ یہ تأثر عام ہو رہا (یا کیا جا رہا) ہے کہ "احمدیوں" کے خلاف فیصلہ محض ووٹوں کے زور پر کر دیا گیا ہے۔ عقاید کی رُو سے انہیں غیر مسلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تأثر اس لئے بھی زمین گیر ہو رہا ہے کہ پارلیمان کی خصوصی کمیٹی کی روئداد بھی پبلک کے سامنے نہیں آئی۔ ہمارے خیال میں یہ صورت حالات خوش آیند نہیں۔ اگر امن عامہ کی خاطر پابندیوں کا جاری رکھنا ناگزیر ہے تو اسے اشتعال انگیز خبروں یا تبصروں تک محدود کر دینا چاہیئے۔ "احمدیوں" کے غلط پراپیگنڈے کی تردید کے لئے ان کے اصلی عقاید، مقاصد اور عزائم کے سلسلہ میں، متین اور سنجیدہ قسم کے لٹریچر کی طباعت و اشاعت پر پابندی جاری نہیں رکھنی چاہیئے۔

(❊)

طلوعِ اسلام کی سترھویں سالانہ کنونشن

امسال بتاریخ ۲۴ رعنایت ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۴ء (بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار حسب سابق بمقام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور منعقد ہو رہی ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی پارٹی سے ہے، نہ مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی اس کا کوئی اپنا فرقہ ہے، نہ امت سے الگ کوئی ملک۔ اس کا مقصد قرآنی فکر و تعلیم کا عام کرنا ہے تاکہ اس سے قوم کے قلب و دماغ میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے یہاں خلافت علیٰ منہاج نبوت کے انداز کا نظام قائم ہو جائے۔

۲۔ کنونشن کے کچھ اجلاس تو مندوبین تک محدود ہوتے ہیں، اور کچھ کھلے اجلاس جن میں عام سامعین بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کھلے اجلاسوں میں علاوہ دیگر مقالات، پرویز صاحب کے خطابات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ امسال ان کے پیش نظر حسب ذیل موضوعات ہیں۔

(۱) استقبالیہ جس میں حالاتِ حاضرہ پر سیر حاصل بحث ہو گی اور "احمدیوں" سے متعلق حالیہ فیصلہ سے پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ لیا جائے گا۔

(۲) "فرد ریاست کے لئے ہے یا ریاست فرد کے لئے"؟ یہ تاریخ کا مشکل ترین سوال ہے جس نے دورِ حاضرہ میں بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے جب فرد سے ریاست (اسٹیٹ) کے نام پر ہر طرح کی قربانی طلب کی جاتی ہے ایک خطاب میں اس سوال کا تحقیقاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

(۳) پاکستان میں فحاشی اور جنسیت کا سیلاب اُمنڈ کر آ گیا ہے جس میں قوم کا نوجوان طبقہ خس و خاشاک کی طرح بہے چلا جا رہا ہے۔ کیا اسے روکنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی ہے؟ ایک خطاب کا موضوع یہ ہے۔

حسب سابق ایک نشست بزم مذاکرہ کیلئے مخصوص ہو گی جس کا موضوع ہو گا

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس میں طلبا اور طالبات اپنے اپنے ذاتی تجربات پیش کریں گے کہ تعلیم کے سلسلہ میں انہیں کس قدر پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اور آخر الامر اس سے حاصل کیا ہوتا ہے؟

اور ایک نشست استفسارات کے لئے جس میں پرویز صاحب سامعین کے سوالات کا جواب قرآنی روشنی میں دیں گے۔

یہ پروگرام مشروط ہے۔ حتمی اور تفصیلی پروگرام وسط اکتوبر تک شائع ہو جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ لاہور

ادارۂ طلوعِ اسلام مرکز کی

کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت

ادارہ طلوع اسلام ہر سال کنونشن کی تقریب پر اپنی شائع کردہ کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت دیا کرتا ہے۔ یہ رعایت ان کتابوں پر جن کی فہرست درج ذیل ہے امسال بھی دیجائیگی۔ شرط یہ ہے کہ جو کتابیں مطلوب ہوں ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر ۱۳ر اکتوبر تک موصول ہو جائے۔ اسکے بعد وہ کتابیں بذریعہ ڈاک بھیجدی جائیں گی اور خرچ ڈاک دی۔ پی کے ذریعے وصول کیا جائے گا۔ کنونشن کے موقعہ پر پنڈال کیساتھ بک سٹال قائم کر دیا جائیگا۔ یہ کتابیں انہی قیمتوں پر وہاں سے بھی دستی خریدی جا سکینگی۔

فہرست کتب جن پر رعایت دی جائیگی:۔ (باقی کتابیں پوری قیمت پر مل سکیں گی)

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ)	۹۵/-	۸۵/-	قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ)	۱۵/-	۱۳/-
لغات القرآن (مکمل سیٹ)	۸۰/-	۷۰/-	سلیم کے نام (مکمل سیٹ)	۳۰/-	۲۴/-
اسلام کیا ہے (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰/-	۸/-	طاہرہ کے نام	۶/-	۵/-
اسلام کیا ہے (سستا ایڈیشن)	۶/-	۵/-	عربی خود سیکھئے	۷/-	۶/-
انسان نے کیا سوچا؟	۱۵/-	۱۰/-	پاکستان کا معمار اول	۳/۵۰	۳/-
ابلیس و آدم	۱۵/-	۱۳/-	فجر الاسلام (اول)	۵/-	۳/-
جوئے نور	۱۵/-	۱۳/-	فجر الاسلام (دوم)	۵/-	۳/-
برق طور	۱۵/-	۱۳/-	منزل بہ منزل	۸/-	۴/-
کتاب التقدیر	۱۵/-	۱۳/-	ISLAM: A CHALLENGE	۲۰/-	۱۶/-
قائد اعظمؒ کے تصور کا پاکستان	۱۲/-	۱۰/-	TO RELIGION. (پیپر بیک)		
معراج انسانیت	۲۵/-	۲۲/-	قتلِ مرتد (غلام اور لونڈیاں)	۲/-	۱/-
سلسبیل	۱۰/-	۶/-	انسانیت کا آخری سہارا	۱/-	-/۵۰
فردوس گم گشتہ	۱۰/-	۶/-	عالمگیر افسانے	۱/-	-/۵۰
من ویزداں	۲۵/-	۲۳/-	PRINCIPLES OF LAW	۲/۵۰	۲/-
اسلامی معاشرت	۴/-	۳/-	MAKING IN ISLAM		
اسباب زوال امت (اعلیٰ)	۲/-	۱/۵۰	تاریخ الامت (مکمل سیٹ)	۲۵/-	۱۶/-
اسباب زوال امت (سستا)	۱/-	-/۵۰	جمع القرآن	۲/۵۰	۲/-
جہاد	۲/۵۰	۲/-	(ناظم ادارہ طلوع اسلام)	..	..

حقائق و عبر

۱۔ اللہ کا شاہکار — کون؟

بانیٔ جماعتِ اسلامی، سید ابوالاعلےٰ مودودی صاحب، پچھلے دنوں، امریکہ سے واپس آئے تو جماعت کیطرف سے لاہور میں ان کا کس طرح استقبال کیا گیا، اس کی روئداد ہفت روزہ ایشیا کی ۲۵ اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

محترم اسٹیج پر سامنے تشریف فرما تھے اور نوجوان انہیں دیکھ کر نئے سے نیا نعرہ اختراع کر رہے تھے۔

اللہ کا شاہکار ——— مودودی
اللہ کا انعام ——— مودودی
اللہ کا احسان ——— مودودی

آپ کسی قلبِ مومن میں جھانک کر پوچھئے کہ اللہ کا شاہکار کون ہے؟ تو وہاں سے ایک ہی آواز آئے گی کہ جملہ کائناتِ انسانیہ میں، اللہ کا شاہکار، محمد رسول اللہ ہیں۔ پرویز صاحب نے جب حضرت عمر فاروقؓ کو — شاہکارِ رسالت — قرار دیا تو وہیں یہ تصریح کر دی کہ "رسولؐ اللہ شاہکارِ خالقِ فطرت، اور فاروق اعظمؓ شاہکار رسالتؐ۔ (شاہکارِ رسالت، ابتدائیہ)۔ لیکن ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ اللہ کا شاہکار (معاذ اللہ) مودودی صاحب ہیں! یاد رکھیئے۔ کسی "خالق" کا "شاہکار" ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ منفرد اور بے مثال ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے شاہکار کہا جاتا ہے۔ خدا کا شاہکار بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہ حضورؐ رسالتمآب کے سوا کون ہو سکتا ہے؟ ان نعروں کے درج کرنے کے بعد اس روئیداد میں لکھا ہے۔

مولانا کے چہرے پر محبت کا رنگ چھایا ہوا تھا اور وہ خاموشی سے ان نعروں کو سن رہے تھے۔ آخر آپ نے ہاتھ سے ان نعروں کو روکتے ہوئے فرمایا کہ مغرب کا وقت قریب ہے اس لئے مجھے کچھ باتیں کہہ لینے دیجئے۔

یعنی مولانا کے سامنے انہیں "اللہ کا شاہکار" قرار دیا جا رہا تھا، اور ان کے چہرے پر محبت کا رنگ چھایا ہوا تھا، اور وہ اس نعرے کو خاموشی سے سن رہے تھے۔ اس سے پیشتر مودودی صاحب کے مصاحب (جو بشیر جماعتِ اسلامی کے تنخواہ دار کارندے ہیں) انہیں مزاج شناسِ رسولؐ اور امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا ہم پایہ قرار دے چکے ہیں۔ اب وہ ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں۔ اور انہیں خدا کا شاہکار قرار دے رہے ہیں — آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

۲۔ ۹/۱۰ حصہ کفر

انجمن خدام الدین لاہور کے ترجمان 'خدام الدین' کی اشاعت بابت ۱۶ اگست ۱۹۷۴ء میں 'شبِ معراج کی تقریب پر' مروجہ غیر شرعی رسوم کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔

پنجاب میں جو اسلام رائج ہے اس کا ۹/۱۰ حصہ کفر سے آیا ہے
ہر کفر کہ کہنہ شد مسلمانی شد!

یہی بات اگر طلوع اسلام کہہ دے تو اُسے گردن زدنی قرار دیدیا جائے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس میں پنجاب کو کیوں مختص کیا گیا ہے؟ کیا ملک کے باقی حصوں میں "خالص" اسلام رائج ہے؟

(۰)

۳۔ قانونِ شریعت میں تبدیلی

مسلک اہل حدیث کے ترجمان، ماہنامہ محدث (لاہور) کی رجب، شعبان ۱۳۹۴ھ کی اشاعت میں ایک شذرہ شائع ہوا ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

ہمارے ایک عزیز دوست نے "زکوٰۃ اور عصری تقاضے" کے عنوان سے زکوٰۃ کے موضوع پر متعدد قسطوں میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں ایک جگہ فرمایا۔۔۔۔۔

ان کے یہ "عزیز دوست" مسلک اہلحدیث ہی سے متعلق ہیں جن کا مقالہ ہفت روزہ 'اہلحدیث' لاہور کی اشاعت بابت ۱۶ اگست ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

خوشحال معاشرہ کا قیام اسلام کا بنیادی نظریہ ہے۔۔۔۔ زکوٰۃ کی فرضیت بھی اسی نقطۂ نظر سے ہوئی ہے۔ تاہم جس معاشرہ اور ماحول میں اس عمل کو فرض کیا گیا ہے وہ آج کل کے ماحول اور معاشرہ سے قدرے مختلف تھا۔۔۔۔ اس سلسلہ میں "قانونِ ضرورت" کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ شرعی قانون کی رُو سے زکوٰۃ چار اشیا پر فرض ہے۔

(۱) مویشی۔۔۔۔ (۲) غلہ اور پھل۔ (۳) نقدی (سونا چاندی)۔ (۴) تجارت

پہلی تین مدات تو بحالہ قائم ہیں، مگر جہاں تک مال کی تجارت کا تعلق ہے، اس کا میدان اب بہت وسیع ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ نصاب زکوٰۃ بھی اسلام میں مقرر ہے لیکن اس معاملہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ کی کم از کم حد ہے۔ زکوٰۃ کا یہ نظام جب رائج کیا گیا تو اس وقت طلب اور رسد کی ضرورت کے مطابق تھا۔ زکوٰۃ کا مقصد صرف یہ نہیں کہ مقررہ اموال میں سے معینہ مقدار ادا کر دی جائے۔ چاہے وہ معاشرتی ضروریات کا ایک فیصد ہی پورا کرے۔۔۔۔ زکوٰۃ کو فقراء اور محتاج لوگوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونا چاہیئے۔ لہٰذا آجکل اس امر کی ضرورت ہے

کہ "ضرورت" کا اندازہ لگا کر نظامِ زکوٰۃ کو ازسرِ نو منظم کیا جائے۔

(ہفت روزہ "اہلحدیث" لاہور ص۳ ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء)

ماہنامہ محدث کی طرف سے اس پر تبصرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> یہ فکرِ جدید طبقہ کی طرف سے وبا کی طرح پھیل رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اہلحدیث جنہوں نے بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں میں ہمیشہ شمع سنت فروزاں رکھی وہ بھی اب ڈانواں ڈول ہونے لگے ہیں۔

آپ نے غور کیا کہ زمانے کے تقاضے کس طرح (اور تو اور خود) اہلحدیث حضرات کو اس قرآنی فکر کی طرف آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں جسے طلوعِ اسلام اتنے عرصے سے پیش کرتا اور "ملحد، بے دین، کافر" قرار پاتا چلا آرہا ہے۔ ابھی تو اس کی ابتدا ہے۔ رفتہ رفتہ ان حضرات کو قرآن کریم کے اس اصول کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ امورِ شریعت کی جن جزئیات کا تعین قرآن کریم نے نہیں کیا، ان کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا مقصود نہیں تھا۔ لیکن ان میں تغیر و تبدل کا اختیار خلافت علیٰ منہاج رسالت کو ہے۔ ہمیں، آپ کو یا کسی اور فرد یا گروہ کو نہیں۔ لہٰذا ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ خلافت علیٰ منہاج رسالت ۔۔ یعنی خلافتِ راشدہ کا نظام پھر سے قائم کیا جائے۔

———— (۰) ————

۴۔ ایک انکشاف

پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ محترم حنیف رامے صاحب نے، ایک پریس کانفرنس میں، ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ:

> پیپلز پارٹی میں مسلمانوں کے علاوہ عیسائی اور دیگر اقلیتی فرقوں کے لوگ بھی شامل ہیں، اس لئے اگر قادیانی بھی پارٹی کے رکن ہیں تو وہ بدستور رکن رہیں گے۔ کیونکہ پارٹی کا آئین ہر پاکستانی کو پارٹی کا رکن بننے کا حق دیتا ہے۔ آپ نے کہا کہ وہ پارٹی کے عہدے دار بھی رہ سکتے ہیں۔ (نوائے وقت ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء)

ہمیں اس سے تو سروکار نہیں کہ کون لوگ پیپلز پارٹی کے ممبر بن سکتے ہیں اور کون نہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کسی پارٹی کا رکن بننے (اور رہنے) کے لئے اس کے منشور کا تسلیم کرنا ضروری ہوتا ہے پیپلز پارٹی کے منشور میں شق اول یہ ہے کہ ۔۔ اسلام ہمارا دین ہے ۔۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس پارٹی کے غیر مسلم اراکین بھی اس کا اعتراف و اقرار کرتے ہیں کہ اسلام ان کا دین ہے؟ ۔۔ یہ تو عجیب سی بات ہوگی!

———— (۰) ————

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى۔ (۵۹/۱۴)

مولوی صاحبان کی ایک دوسرے سے عداوت اور نفرت ضرب المثل ہے، لیکن امت کو باور کرایا گیا کہ مسئلہ ختم نبوت پر یہ سب متفق ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کے اس اتحاد و اتفاق کا منظر اس عظیم اجتماع میں سامنے آیا جو یکم ستمبر کی شب، لاہور کی شاہی مسجد میں منعقد ہوا تھا اور جس میں مختلف الخیال علماء حضرات ایک اسٹیج پر جمع تھے۔ یہ روئداد ہفتہ وار لیل و نہار کے ۸ تا ۱۵ ستمبر کے پرچہ سے پیش کی جارہی ہے۔

"مولانا مودودی کی تقریر شروع ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ سٹیج کے عین سامنے ڈیوڑھی میں نعرے بلند ہوئے وہ تقریر کرتے رہے اور نعرے لگاتے ہوئے چند درجن آدمی آگے بڑھتے آئے۔ وہ ڈیوڑھی سے سیدھے مجمع کو چیرتے ہوئے سٹیج کی طرف آرہے تھے۔ ڈیڑھ دو لاکھ انسان اس طرح بیٹھے تھے کہ کوئی فرد درمیان سے نہیں گزر سکتا تھا۔ ڈیوڑھی سے برآمدوں کی طرف سے ہو کر بھی سٹیج تک آیا جا سکتا تھا، مگر معلوم نہیں کیوں آنے والے بیٹھے ہوئے سامعین کے درمیان سے آرہے تھے۔ ان کی وجہ سے سامعین میں ہل چل مچ گئی۔ لیکن مولانا تقریر کرتے رہے۔ پاس آئے تو معلوم ہوا نوی اسمبلی کے رکن اور جمعیت العلمائے اسلام کے رہنما مولانا مفتی محمود ہیں۔ وہ مجمع کو چیرتے ہوئے سیدھے سٹیج کی طرف آئے۔ ان کے ساتھ نعرے لگانے والے بھی سامنے سے سٹیج پر چڑھے جہاں مولانا مودودی تقریر کر رہے۔ جماعت اسلامی کے کارکن مولانا کو اٹھا کر پیچھے لے گئے۔ ان کے ساتھ ہی پروفیسر عبدالغفور چوہدری غلام جیلانی۔ خلیل حامدی۔ بارک اللہ خاں، اور جماعت کے دیگر تمام کارکن چلے گئے۔ مفتی محمود کے ساتھ آنے والے سٹیج پر مفتی اعظم زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے جن میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے چند معروف کارکن بھی تھے جنہوں نے جمعیت العلمائے اسلام کے کارکنوں کے بیج لگا رکھے تھے۔ اب سٹیج پر مفتی محمود کے ساتھ آنے والوں کا قبضہ تھا۔ ایک گروہ سید مودودی زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہا تھا لاہور مجلس عمل کا کوئی عہدیدار سٹیج پر موجود نہیں تھا۔"

اس کے بعد "مفتی صاحب تقریر کے لئے اٹھے، بعض جوشیلے چودہ پندرہ لڑکے نعرے لگانے لگے۔ تمام سامعین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جمعیت العلمائے اسلام کے کارکنوں نے بھی مفتی محمود زندہ باد کے نعرے لگائے۔ آدھ گھنٹے تک ہنگامہ جاری رہا۔"

یہ ہے دین کے اہم ترین مسئلہ پر ان حضرات کے اتحاد و ائتلاف کی کیفیت!

اسے نوٹ کر رکھیے

مسئلہ ختم نبوت کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے جو تجاویز پیش کی تھیں، ان میں ایک تجویز یہ بھی تھی۔

اللہ کی توحید، تمام انبیاء کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی ماننا، تمام کتب الٰہیہ کے بعد قرآن مجید کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کرنا اور آخرت پر ایمان رکھنا، اسلام کے لازمی بنیادی عقائد ہیں۔ جن میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ (ترجمان القرآن۔ بابت ستمبر ۱۹۷۰ء۔ ص ۳۵)

یہ صحیح ہے، لیکن اس ضمن میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کریم نے توحید، انبیاء، کتب، اور آخرت کے علاوہ ملائکہ پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جو شخص ان بنیادی عقائد پر ایمان رکھتا ہو، جزئی اختلافات کی بنا پر اسے کافر قرار دینا یا مطعون کرنا جائز نہیں۔ جماعتِ اسلامی کے افراد کو، مودودی صاحب کے پیش کردہ اصول کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے جھوٹے الزامات تراشنا اور دوسروں کے خلاف نفرت پھیلانا اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔

(٥)

کاتب کی ضرورت

ادارہ طلوعِ اسلام کے لئے ایک ہمہ وقتی، پختہ قلم لیتھو کاتب کی ضرورت ہے۔ معاوضہ معقول۔ کام مستقل۔ معاملہ حسن کارانہ — خواہشمند حضرات اپنے قلمدان کے ساتھ (اتوار کو چھوڑ کر) کسی دن شام پانچ بجے سے سات بجے تک، تشریف لا سکتے ہیں۔

پتہ:- ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ نزد مین مارکیٹ متصل پولیس اسٹیشن

طلوعِ اسلام کے متعلق شکایات

"طلوعِ اسلام کی کتابت اچھی نہیں رہی۔ اس کی طباعت کا معیار گر گیا ہے۔ اس کے صفحے الٹ پلٹ لگ جاتے ہیں۔ رسالہ پہنچتا نہیں۔" یہ اور اسی قسم کی عام شکایات ہم تک پہنچتی ہیں۔ شکایت کرنے والے دوستوں کی شکایات بجا اور درست، لیکن جو ہم پر بیت رہی ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ملک میں پریس، کاروباری حلقہ، عام نظم و نسق میں جس قدر ابتری پھیل رہی ہے اس کا شکار ہم بھی ہو رہے ہیں۔ یہ تو ایک مشن کی لگن ہے جو ہم ان مشکلات کو برداشت کئے جا رہے ہیں۔ ورنہ طلوعِ اسلام کے جاری رہنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اپنی طرف سے ہم ان شکایات کے ازالہ کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں، لیکن احباب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس پر برافروختہ نہ ہوا کریں۔ ہماری مجبوریوں کے پیش نظر ہم سے تعاون کیا کریں۔ اس کے لئے ہم ان کے شکرگذار ہوں گے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

شہدائے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کی یاد میں

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

زندہ قومیں ان دنوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھتی ہیں جب اُن کی ملی تاریخ میں کوئی انقلاب آفریں واقعہ نمودمیں آیا ہو۔ یہ یاد ان دنوں کی نہیں ہوتی بلکہ ان محسنین کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کی تقریب ہوتی ہے جن کے ہاتھوں وہ انقلاب رونما ہوا تھا۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ آنے والی نسلوں کے دل میں، ان مشاہیر کے نقوشِ قدم پر چلنے کا ولولہ بیدار رہے۔ جب کوئی قوم روبہ انحطاط ہوتی ہے تو ان کی زندگی کے صفحات سے ان یادوں کے نقوش مدھم پڑنے شروع ہو جاتے ہیں یا اگر وہ باقی رہتے ہیں تو محض ممی شدہ لاشوں کی طرح۔ قوموں کی زندگی چونکہ دنوں، مہینوں، برسوں سے نہیں بلکہ صدیوں کے پیمانے سے ماپی جاتی ہے۔ اس لئے ان میں ثبات و محو کا عمل بھی سینکڑوں سال کے بعد ظہور میں آتا ہے۔

ہماری ملی زندگی میں یوم پاکستان (۲۳ مارچ) جب قوم نے ایک آزاد مملکت کے حصول کے عزم کا اظہار کیا۔ یوم آزادی (۱۴ اگست) جب اسے وہ مملکت حاصل ہو گئی۔ اور ان کے بعد ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء جب اسے شہدائے پاکستان کے مقدس خون کے صدقہ میں حیاتِ تازہ عطا ہوئی، ایسے عظیم دن تھے جن کی یاد ہمیشہ درخشندہ و تابندہ رہنی چاہیئے تھی۔ لیکن افسوس کہ قوم کے حافظہ سے ان کی یاد کے نقوش ماند پڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور قیامت یہ کہ اس محل ویرانگی کی ابتدا صدیوں بعد نہیں، ہماری ملی عمر کے پہلے ربع صدی میں ہی ہو چکی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے طلوع اور روبہ زوال ہونے کی مثال تاریخ میں کہیں اور بھی مل سکے۔!

طلوع اسلام اپنی بساط کے مطابق ان نقوش کی یاد تازہ رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ یوم آزادی کی تقریب پر پرویز صاحب کا بصیرت افروز خطاب (سابقہ اشاعت میں) آپ کے سامنے آچکا ہے۔ ذیل میں ہم، ان کا وہ حقائق پر درخطاب درج کرتے ہیں جو انہوں نے، جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی ولولہ انگیز یاد میں ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کو پیش کیا تھا۔ اس خطاب کی تمہید میں انہوں نے، کیریکٹر کے تعارف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا تھا وہ اس قابل ہے کہ اسے قوم کی نئی نسل کے سامنے بار بار لایا جائے۔ اس کے بعد انہوں شہدائے پاکستان کا تذکرہ

جس دلسوزی اور خونناب فشانی سے کیا ہے، اِسے تو کوئی بھی آنسو بہائے بغیر پڑھ نہیں سکتا۔ یہ اس لئے کہ

صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

اب وہ خطاب ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)

صدر گرامی قدر، و عزیزانِ محترم۔ سلام و رحمت!

آج صبح، نماز کے وقت، ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو آواز آئی — پرویز صاحب! یومِ استقلالِ پاکستان مبارک — آواز اس قدر جذب و کیف میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے سننے کے ساتھ ہی — اِک لرزشِ خفی میرے سارے بدن میں تھی — یہ آواز تھی جنگِ ستمبر کے اس مردِ مجاہد کی جس نے کھیم کرن اور چونڈہ، دونوں محاذوں پر سرفروشانہ معرکے سر کئے تھے، اور جنگ کے بعد جن کی دعوت پر مجھے، پاکستان کی نئی زیارت گاہوں کی خاک بوسی کی سعادت نصیب ہوئی تھی[1] — میں نے ان کا دلی شکریہ ادا کیا لیکن اس احساس سے بے حد ندامت ہوئی کہ اس ہدیۂ تبریک کی پہل میری طرف سے ہونی چاہیئے تھی کیونکہ اس کے حقیقی مستحق تو یہ مجاہد اور غازی تھے جن کی جاں فروشیوں کے تصدق ہم آج زندگی سے ہمکنار ہیں — لیکن شہید اور غازی پر کون سبقت لے جا سکتا ہے۔ اس لئے اس باب میں بھی سبقت انہی کا حق تھا۔ حقیقت یہ ہے برادرانِ عزیز، کہ اگر ہمارا ملی احساس بیدار اور ہماری غیرت جوان ہوتی تو ہمیں آج کا دن جشنِ عید کی طرح منانا چاہیئے تھا جسے آپ عید (الفطر) کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس واقعہ کی یاد کا جشن ہے۔ روزے، سب سے پہلے ۲ھ میں فرض ہوئے اور سترہ رمضان کو بدر کے میدان میں، حق و باطل کی ابدی کشمکش کا وہ معرکہ پیش آیا جو انسانیت کی موت اور حیات کے لئے فیصلہ کن لمحہ تھا — اور رمضان ہی میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ عید الفطر، نزولِ قرآنِ کریم اور فتح بدر کا جشن عید تھا۔ یہی فیصلہ کن حیثیت ہماری ملی زندگی میں ستمبر ۱۹۶۵ء کے معرکہ کو حاصل ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد، سال میں دو دن ایسے آتے ہیں جنہیں ہم حاصلِ مراد قرار دیتے تھے۔ ایک یومِ پاکستان، جب قوم نے اپنے لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت کے حصول کے عزم راسخ کا اعلان کیا۔ اور دوسرا یومِ آزادی، جب ہمارا مقصود حاصل ہو گیا۔ لیکن اب ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں یہ تیسرا دن ایسا ہے جو ان دونوں دنوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس لئے زیادہ اہم ہے کہ ایک پیدائشی اندھے کی بینائی سے محرومی بھی کچھ کم وجہِ سوہانِ روح نہیں ہوتی۔ لیکن جو شخص بینائی حاصل کرنے کے بعد، کسی حادثہ سے، پھر سے نابینا ہو جائے، اس کی باقی زندگی کس قیامت خیز کربِ اضطراب سے گذرتی ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حصولِ آزادی سے پہلے، ہم آزادی کی لذت سے ناآشنا تھے۔ اس لئے اس سے محرومی ہمارے لئے باعثِ دردِ سر تو ضرور تھی، وجہِ سوزِ جگر نہیں تھی۔ لیکن آزادی ملنے کے

---

[1] جنگ کے مختلف محاذوں کے پرویز صاحب کے چشم دید حالات "پاکستان کی نئی زیارت گاہیں" کے عنوان سے طلوعِ اسلام میں بالاقساط شائع ہوئے تھے۔

بعد، اگر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے نتیجہ میں 'خدا نکردہ' ہزار بار خدا نکردہ، ہم اپنی آزادی سے محروم ہو جاتے تو اس سے ہماری جو حالت ہو جاتی، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو میرے نزدیک 'وہ دن' جب ہماری آزادی چھنتے چھنتے بچی اور ہماری متاعِ حیات لٹتے لٹتے محفوظ رہی' ہماری تاریخ کا عظیم ترین دن ہے۔ اور وہ جنہوں نے اس وقت اپنی جانیں دے کر ہماری زندگی کا سامان مہیا کر دیا، اس قابل کہ — جب تک پاکستان زندہ و پائندہ ہے خدا سے ابدالاباد تک زندہ و پائندہ رکھے — ملتِ پاکستانیہ کا ہر فرد، بصد خلوص و محبت' اور بہ ہزار تسلیم و نیاز' ان کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرے۔

مرے خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۲/۱۵۷)

ہم میں کیریکٹر نہیں

عزیزانِ من! آج جو درد مند حضرات قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں' وہ سب کچھ کہہ سن لینے کے بعد، ایک لمبی' ٹھنڈی سانس بھر کر' باصد حسرت و یاس' یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ صاحب! قوم کی جو جو خرابیاں گنائی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں۔ وہ جس تباہی کے گڑھے کی طرف کشاں کشاں اور رواں دواں چلی جا رہی ہے، اس کا بھی ہمیں احساس ہے۔ اس زوال اور انحطاط کا جو انجام ہوا کرتا ہے وہ بھی ہماری چشمِ تصور کے سامنے ہے لیکن ان خرابیوں کے اسباب و علل پر ہم جوں جوں غور کرتے ہیں ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم میں کیریکٹر نہیں رہا۔

جس نتیجہ پر یہ حضرات پہنچتے ہیں وہ باون تولے پاؤ رتی درست ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ قومیں ڈوبتی اسی وقت ہیں جب ان میں کیریکٹر نہیں رہتا۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟ وہ کیا چیز ہے جس کا قوم میں فقدان ہے۔ کیریکٹر کا لفظ تو ایک اصطلاح ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی اصطلاح کا مفہوم واضح نہ ہو، بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ آج ہمارے ہاں جس قدر ذہنی خلفشار اور عملی تشتت و انتشار پیدا ہو رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوم کو یکے بعد دیگرے، نہایت خوشنما، نگاہ فریب، سحر انگیز اصطلاحات دی جا رہی ہیں جن کا متعین مفہوم کبھی سامنے نہیں لایا جاتا۔ یہ مبہم اصطلاحات رفتہ رفتہ سلوگن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور پھر بلند آہنگ نعرے بن کر فضا میں ارتعاش پیدا کئے چلی جاتی ہیں۔ عوام ان اصطلاحات سے مسحور ہو کر آنکھیں بند کئے، ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں، اور نہ یہ کسی سے پوچھتے ہیں' نہ انہیں کوئی بتاتا ہے کہ ان الفاظ کے معانی کیا ہیں اور ان اصطلاحات کا مفہوم کیا، جن کی خاطر انہیں اس قدر قربانیاں دینے کے لئے آمادہ اور مشتعل کیا جاتا ہے۔ "ہم اس لئے تباہ ہو گئے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے۔" "ہم جب تک اسلام کے پابند نہیں ہوتے، ہماری بگڑی بن نہیں سکتی۔" "ہمیں

محض سلوگن

کہیں سے کوئی نظریہ، کوئی مسلک کوئی لائحہ عمل مستعار لینے کی ضرورت نہیں۔ اسلام' ہماری بلکہ پوری نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔" یہ اور اسی قسم کے دیگر سلوگن' ہم برسوں

سے سنتے چلے آ رہے ہیں اور ان نعروں سے مسحور ہو کر نہ معلوم عوام کس قدر قربانیاں دے چکے اور دے رہے ہیں۔ لیکن آج تک اتنا کسی نے نہیں بتایا کہ وہ اسلام ہے کیا جسے چھوڑنے سے ہمارا یہ حشر ہو گیا ہے' اور جسے اختیار کرنے سے ہمارا ہر کام سنور جائے گا۔ "اسلام" کی اصطلاح سے آگے بڑھے تو پھر "اسلامی نظام" "اسلامی آئین" "اقامتِ دین" "نظامِ شریعت" جیسی اصطلاحات سامنے لائی گئیں اور عوام سے کہا گیا کہ ان کی تمام مشکلات کا حل اس نظام اور آئین کے اندر موجود ہے۔ عوام بیچارے ان دعاوی کو بھی الہاماتِ مسیحا سمجھ کر ان کے پیچھے لگ گئے۔ لیکن انہیں کسی نے اتنا بتلانے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ان اصطلاحات کا عملی مفہوم کیا ہے۔ پھر "بحالیٔ جمہوریت" کی اصطلاح کا غوغا بلند ہوا اور اس زور شور سے کہ اس نے صورِ اسرافیل کو بھی مات کر دیا۔ اصطلاح یہ بھی مبہم ہی رکھی گئی۔ آجکل فضا میں "اسلام کا معاشی نظام"۔ "اسلامی سوشلزم" "مساواتِ محمدیؐ" جیسی اصطلاحات گونج رہی ہیں۔ اس میں بھی ہر مدعی کا دعویٰ یہ ہے کہ اصلی اور سکہ بند مال صرف اسی کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ دوسروں کے ہاں جعل سازی ہے، نقالی ہے، فریب ہے، دغا بازی ہے۔ لیکن کیفیت پھر وہی ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم کوئی بھی واضح نہیں کرتا۔

اب ظاہر ہے کہ جس قوم کا معمولِ زندگی یہ ہو چکا ہو کہ اس میں اصطلاحات عام کی جائیں لیکن ان کا مفہوم کبھی واضح نہ کیا جائے، وہاں اگر یہ کہا جائے کہ ہماری تمام خرابیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا، لیکن اس کی وضاحت نہ کی جائے تو اس کا گلہ کس سے کیا جائے اور تقاضا کس سے؟ تقاضا کرنے پر بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ یہاں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے، دوسرے کو دھوکا دیتا ہے، رشوت کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا، ہر شخص جائز اور ناجائز ہر طریق سے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے، اس کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان خرابیوں کا سبب یہی ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا لیکن سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں' جس کے نہ ہونے سے یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں — آیئے، آج کی نشست میں یہ دیکھیں کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟ کہ جب تک اس اصطلاح کا مفہوم واضح نہیں ہوگا، جن مردانِ حق آگاہ کی یاد منانے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کی عظمتِ شان اور رفعتِ مقام کے صحیح نقوش اجاگر نہیں ہو سکیں گے۔

—————— (۰) ——————

کیریکٹر کسے کہتے ہیں؟

کیریکٹر کی وضاحت' میں عام طور پر ایک مثال سے کیا کرتا ہوں جسے دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ نقاہت سے آپ کا برا حال ہو رہا ہے۔ آپ اپنے ایک دوست کے ہاں جاتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ پلاؤ کا گرم گرم تھال آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ آپ لپک کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ لقمہ اٹھاتے ہیں کہ اتنے میں باورچی اندر سے آ کر کہتا ہے کہ صاحب! یوں تو اس پلاؤ میں ہر چیز نہایت اعلیٰ معیار کی ہے لیکن غلطی سے نمک کی جگہ اس میں سنکھیا پڑ گیا ہے۔ سوچئے! کہ کیا آپ اس کے بعد' وہ لقمہ منہ میں ڈال لیں گے؟ آپ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ اتنی شدید بھوک کے باوجود آپ اسے باہر پھینک دیں گے — ڈر اور لالچ دو ہی محرکات

ہوتے ہیں جن سے آپ کسی سے اس کی خلافِ منشار کام کرا سکتے ہیں۔ اُس وقت اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ آپ اس پلاؤ کو کھائیے ورنہ آپ کو قید کرا دیا جائے گا تو آپ پھر بھی اُسے نہیں کھائیں گے۔ اور اگر کوئی شخص آپ کو پچاس ہزار روپیہ رشوت کے طور پر دے تو آپ اسے بھی ٹھکرا دیں گے۔ زہر آلود پلاؤ کبھی نہیں کھائینگے۔ اس سوال کے جواب کے لئے کہ آپ ایسا کیوں نہیں کریں گے، اس قدر شدت کی بھوک، قید و بند کے خوف اور اتنی بڑی رشوت کے لالچ کے باوجود، اُسے کیوں ٹھکرا دیں گے، کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے کہ اس کے کھانے سے چونکہ آپ کو جان کا خطرہ لاحق ہے اس لئے آپ بھوک برداشت کر لینگے لیکن اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالیں گے۔ بالفاظِ دیگر، جان کے خطرے کے مقابلہ میں آپ بھوک کی تکلیف کو ترجیح دیں گے۔

اب اسی مثال کو آپ ذرا آگے بڑھائیے۔ جب آپ نے اس پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تھا، اگر اس وقت آپ کا وہ دوست آپ سے یہ کہتا کہ بھائی! اس پلاؤ میں ہر شے بالکل خالص اور اعلیٰ درجہ کی ہے۔ لیکن یہ ہے چوری کے مال کا۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس وقت بھی اس نعمت کو باہر پھینک دیں گے یا کھا جائیں گے۔ بس اس سوال کے جواب سے یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ اگر آپ اسے کھا جائیں گے تو کہا جائے گا کہ آپ میں کوئی کیریکٹر نہیں۔ اور اگر آپ بھوک کی تکلیف برداشت کر لیں گے، لیکن اس ناجائز مال سے حاصل کردہ کھانے سے پرہیز کریں گے تو سمجھا جائے گا کہ آپ کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اور اگر آپ مہیب سے مہیب خوف اور بڑے سے بڑے لالچ کے باوجود، اس کے کھانے سے اجتناب کریں گے تو کہا جائے گا کہ آپ کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔

لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ اتنی سخت بھوک کے باوجود، ایسے اچھے کھانے کو کیوں مسترد کرتے ہیں؟ آپ اسے کھا کیوں نہیں لیتے؟ اس میں سنکھیا تو پڑا نہیں جو آپ کو نقصان کا احتمال اور جان کا خوف ہو۔ وہ تو نہایت عمدہ کھانا ہے، چوری کا ہے تو ہوا کرے، اس سے کھانے کی نوعیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے اور اسی کے سمجھنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں اور جو لوگ ایسے مقام پر کیریکٹر کا ثبوت دیتے ہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔

(۰)

ماہرین علم الحیات ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی اپنے مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی حیوانات کے پیکر میں نمودار ہوئی تو اس کی اگلی کڑی انسانی ہیئت تھی جسے قرآن نے احسن تقویم سے تعبیر کیا ہے اور جسے ہم سمجھنے کی خاطر، انسانی سطح زندگی کہہ کر پکارتے ہیں۔ انسان میں اگر $\frac{9}{10}$ حصہ حیوانی زندگی ہے تو $\frac{1}{10}$ حصہ انسانی زندگی کا بھی ہے جو حیوانی زندگی سے یکسر متمیز اور ممتاز ہے۔ حیوانات ایک اندرونی تہیج (URGE) کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں جسے جبلت (یا INSTINCTS) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حیوانی جبلت کے تقاضے

ان میں سب سے بنیادی جذبہ تحفظِ خویش (SELF-PRESER-VATION) کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ذی حیات، ہر قیمت پہ اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کیلئے

اسے جس قدر اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُسے حاصل کرتا اور محفوظ رکھتا ہے۔ چیونٹی کی ننھی سی جان ہوتی ہے۔ اس کے راستے میں ایک ذرا سا تنکا رکھ دیجئے اور دیکھئے کہ وہ اس سے محفوظ رہنے کے لئے کس قدر تڑپتی اور تلملاتی ہے۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ بلّی کے پاؤں جلنے لگے تھے تو اس نے اپنے بچے کو پاؤں تلے لے لیا تھا۔ تو وہ بھی اسی جذبۂ تحفظِ خویش کی نمود تھی۔ زندگی نے تحفظِ خویش کا یہی جذبہ انسان کو بھی ودیعت کیا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا اور زیادہ سے زیادہ سمیٹتا ہے۔ اس کا محرک یہی جذبہ ہے۔ یہی اس کے نزدیک نفع اور نقصان ماپنے کا پیمانہ ہے۔ ہر وہ عمل جس سے اسے تحفظ حاصل ہو اس کے نزدیک نفع بخش ہوتا ہے اور جس سے اس کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہو، نقصان رساں۔ وہ جو آپ نے زہر آلود پلاؤ نہیں کھایا تھا تو اس کا محرک بھی یہی جذبۂ تحفظِ خویش تھا۔ اس میں نہ آپ کی کوئی کارگری تھی، نہ خصوصیت۔ ایسے مقام پر ہر حیوان بھی یہی کرتا ہے۔ جس چیز سے اُسے خطرہ لاحق ہوتا ہے وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ چیل کے سائے سے مرغی کے چوزے کس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں تلے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور بلّی کی میاؤں سے چوہیاں کس طرح بلوں میں گھس جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی جان بچانے کے لئے بھوک کی تکلیف برداشت کرتا ہے تو اسے اس کا کیریکٹر نہیں کہا جائے گا۔ اگر کیریکٹر کا یہی معیار ہو تو پھر جانوروں سے بڑھ کر بلند کیریکٹر کا حامل کون ہو سکتا ہے؟ اگر آپ اپنے نفع کی سوچتے ہیں اور نقصان سے بچتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ آپ سمجھ سے کام لیتے ہیں ــــ کیونکہ پاگل اُسے کہتے ہیں جو اپنے نقصان کا خیال نہ رکھے۔ دنیا اس پر ہنستی ہے۔

لیکن اس سے آگے ایک اور مقام آتا ہے جو حیوان اور انسان کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ ایک بیل کو بھوک لگے اور اس کے دائیں جانب اپنے مالک کا کھیت ہو اور بائیں جانب کسی اور کا، تو وہ دائیں اور بائیں میں امتیاز کئے بغیر جس کھیت سے جی چاہے چارہ چرنے لگے گا ــــ اور یہ چیز اس کے خلاف نہ قانونی جرم قرار پائے گی نہ اخلاقی عیب۔ لیکن ایک انسان اگر ایسے مقام پر، اپنے کھیت کے بجائے غیر کی کھیتی سے غلّہ لے جائے تو کہا جائے گا کہ اس نے ایک ناجائز کام کیا ــــ جائز اور ناجائز کی تمیز، انسانی سطح زندگی سے شروع ہوتی ہے۔ حیوانی سطح پر اس کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔

جائز اور ناجائز کی تمیز

اس جائز و ناجائز کا تعین ایک تو انسانی معاشرہ کرتا ہے ــــ بعض باتوں کو وہ قانوناً ناجائز قرار دیتا ہے اور بعض کو سوسائٹی کے نقطۂ نگاہ سے معیوب۔ لیکن معاشرہ کا یہ معیار، حالات اور مصالح کے مطابق بدلتا رہتا ہے ــــ آج جو بات قانوناً ناجائز ہے، کل ہی جب اُس قانون میں ترمیم کر دی جائے گی تو وہ جائز قرار پا جائے گی۔ آج جس روش کو سوسائٹی معیوب قرار دیتی ہے کل وہ روش سوسائٹی کا معمول (فیشن) بن سکتی ہے ــــ علاوہ ازیں، ہر ملک کا قانون الگ الگ اور ہر قوم کا معاشرہ جدا جدا ہوتا ہے۔ جو بات ایک کے ہاں معیوب و مذموم ہوتی ہے وہ دوسرے کے ہاں مستحسن و ممدوح سمجھی جاتی ہیں۔ لہٰذا انسانی معاشرہ کا معیار عالمگیر انسانیت کے لئے جائز اور ناجائز، محبوب اور مذموم کا معیار نہیں بن سکتا۔ یہ معیار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوا ہے جو عالمگیر بھی ہے اور زمان و مکان کی حدود سے ماورا، غیر متبدل اور ابدیت کنار

اس کا معیار

بھی۔ اس معیار کی رُو سے جو امور جائز اور مستحسن قرار پاتے ہیں' انہیں اسلام کی زبان میں مستقل اقدار (PERMA-NENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے طبیعی تقاضوں کا تعلق، اس کی حیوانی سطحِ زندگی سے ہے اور مستقل اقدار کا تعلق اس کی انسانی سطحِ زندگی سے۔ جو نظریۂ حیات، جو تصورِ زندگی جو مسلک و مشرب' انسان کی طبیعی زندگی ہی کو زندگی کی آخری کڑی اور اس کے طبیعی تقاضوں ہی کو منتہائے مقصود اور حاصلِ مراد سمجھتا ہے

صرف حیوانی زندگی کفر ہے

قرآن اسے کفر سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲)، جو لوگ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور جسم کے طبیعی تقاضوں ہی کو منتہائے مقصود قرار دے لیتے ہیں' انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس' جو لوگ زندگی کے طبیعی تقاضوں کے ساتھ ساتھ مستقل اقدار کی صداقت پر بھی یقین رکھتے ہیں' انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ جسم کے طبیعی تقاضے' یا بالفاظِ دیگر' حیوانی جبلت (INSTINCT) تو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ اسی لئے ان کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی طبیعی تقاضا اور مستقل قدر میں تصادم ہو جائے۔ یعنی ان میں (TIE) پڑ جائے تو اس وقت جو شخص طبیعی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے مستقل قدر کو قربان کر دے، اس کے متعلق کہیں گے کہ اس میں کیریکٹر نہیں۔ اور جو شخص مستقل قدر کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے وہ بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ "مال صدقۂ جان' اور جان صدقۂ آبرو" سمجھ بوجھ اور کیریکٹر کے مفہوم کی وضاحت کیلئے نہایت جامع محاورہ ہے۔

اب ہمارے سامنے ابرادرانِ عزیز! کیریکٹر کی صحیح (DEFINITION) اور اس کا مفہوم آ گیا۔ یعنی جب جسم

کیریکٹر کا مفہوم

کے کسی تقاضا، یعنی حیوانی جبلت اور مستقل قدر میں تصادم ہو تو جبلی تقاضا کو قربان کر کے مستقل قدر کو محفوظ رکھنے کا نام کیریکٹر ہے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ وہ پلاؤ دیسے تو خالص اور عمدہ ہے لیکن ہے چوری کا، تو اس وقت، جسم کے ایک طبیعی تقاضے اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ بھوک کا تقاضا تھا کہ پلاؤ کھا لیا جائے۔ لیکن مستقل قدر کا فرمان تھا کہ اُسے چھوا تک نہ جائے۔ اگر آپ نے بھوک کے تقاضے کو ترجیح دے کر اسے کھا لیا تو آپ نے کیریکٹر کا ثبوت نہ دیا۔ اگر آپ نے بھوک کی تکلیف کو برداشت کر لیا لیکن مستقل قدر کو ہاتھ سے نہ چھوڑا تو آپ نے عمدہ کردار کا مظاہرہ کیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کسی معاملہ میں ذرا سا جھوٹ بولنے سے، دس ہزار روپیہ بلا تکلف آپ کی جیب میں آ جاتا ہے، بایں ہمہ کہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر تک نہیں ہو سکتی۔ اگر اس وقت آپ اتنے بڑے لالچ کو ٹھکرا دیتے ہیں اور سچ پر قائم رہنے کی مستقل قدر کی حفاظت کرتے ہیں تو اس کو کہیں گے آپ کا کیریکٹر۔۔۔ بس یہ ہے کیریکٹر اور عدمِ کیریکٹر میں فرق اور یہ ہے کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز۔ جس قدر شدید وہ تقاضا ہو گا جس پر آپ مستقل اقدار کو ترجیح دیتے ہیں' اتنا ہی بلند آپ کا کیریکٹر ہو گا اور اتنا ہی درخشندہ آپ کا حسنِ عمل۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، جبلی تقاضوں (INSTINCTS) میں تحفظِ خویش، یعنی جان کی حفاظت کا جذبہ شدید ترین ہے۔ خود قرآن کی رو سے بھی انسانی جان کس قدر گراں بہا ہے' اسکا اندازہ

سورہ المائدہ کی اس آیت سے لگائیے جس میں اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲) جس نے کسی ایک انسانی جان کو بھی ناحق تلف کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کی زندگی ضائع کر دی۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا یوں سمجھو گویا اس نے ساری نوعِ انسانی کو بچا لیا۔ اسی لئے اس نے تاکیداً کہا ہے کہ — وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ (۲/۱۹۴) اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالا کرو۔

لیکن مصافِ زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں ایک طرف جان جیسی متاعِ گراں بہا ہوتی ہے اور دوسری طرف حق کی حفاظت، جو بلند ترین مستقل قدر ہے۔ یہ مقام بڑی شدید کشمکش کا مقام، اور یہ آزمائش بڑی صبر آزما اور ہمت طلب آزمائش ہوتی ہے۔

موت اور حیات کی کشمکش

حیوانی جبلت کا شدید ترین تقاضا۔ تحفظِ خویش — پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ تم نے ایک قدم آگے بڑھایا اور موت کے بھیانک غار میں جا گرے۔ دوسری طرف انسانی زندگی کی نشید جاں فزا یہ مژدۂ دلنواز و روح پرور سنا رہی ہوتی ہے کہ ایک قدم آگے بڑھاؤ اور حیاتِ فانی کے مادی قالب سے نکل کر حیاتِ جاوداں کی عروسِ جمال افروز سے ہمکنار ہو جاؤ۔ یہی وہ شدید ترین کشمکش ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲) موت اور حیات کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ تم دیکھ سکو کہ تمہاری ذات میں اس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے کہ تم اس جہانِ رنگ و بو کی رعنائیوں اور دلکشیوں سے صرفِ نظر کر کے حیوانی زندگی کے اس قدر شدید تقاضے کو ٹھکرا کر، حیاتِ جاوید کے مستحق قرار پا جاؤ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، تم اس حقیقت کا مشاہدہ کر لو کہ

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔ (۸/۲۴) اے مومنین! تم خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں ایسی چیز کی طرف بلاتی ہے جس سے تمہیں حقیقی زندگی عطا ہو جائے گی۔ یعنی ایک تمہاری موجودہ زندگی ہے جو طبیعی قوانین کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے اور جس نے ایک دن بالآخر ختم ہو جانا ہے۔ خدا اور رسول کی یہ دعوت تمہیں اس عارضی زندگی کے بجائے، وہ حقیقی زندگی عطا کر دے گی جو کبھی فنا نہیں ہوگی۔ تم اس سودے کے نفع اور نقصان پر غور کرو اور سوچو کہ یہ دعوت تمہیں کس قدر قلیل قیمت کے عوض کیسی متاعِ بے بہا دے رہی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جب تک زندگی اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ نہیں ہوتا تھا، یہ زندگی اس قابل تھی کہ اس کا پورا پورا تحفظ کیا جاتا۔ لیکن جب ان دونوں میں تصادم ہو جائے تو پھر طبیعی زندگی کے معیارِ نفع و نقصان سے بلند ہو کر، حقیقی زندگی کی منفعت بخشیوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ یہی مومن کا شعار ہے۔ یہی بلندیٔ کردار کا ثبوت ہے۔ یہی مفہوم ہے اس بلند حقیقت کا جسے اقبالؒ نے ان حسین الفاظ میں بیان

کیا ہے کہ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

جو مردانِ حقیقت شناس، عام حالات میں اپنی جان کی حفاظت کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں، لیکن جب مستقل اقدار کے تحفظ کا سوال سامنے آجائے تو اسی جان کو بطیبِ خاطر، ہنسی خوشی جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ان کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری سطح بین نگاہیں یہی فیصلہ دیں گی کہ وہ مر گئے۔

حیاتِ جاوداں کے مستحق

کیونکہ ان کی سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اصل .... یہ ہے کہ وہ درحقیقت مرتے نہیں۔ وہ زندگی کی نچلی سطح کی قیمت ادا کر کے اس سے بلند تر سطح کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۔ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (۲/۱۵۴) جو لوگ اللہ کی راہ میں، یعنی مستقل اقدارِ خداوندی کی حفاظت کے لئے قتل ہو جائیں، انہیں مردہ مت کہو۔ وہ مُردہ نہیں زندہ ہیں۔ لیکن تمہارا شعور جو زندگی کو محض نفس شماری سمجھتا ہے، اس بلند سطح کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتا۔

میزانِ خداوندی میں اس سے زیادہ وزنی کوئی حسنِ عمل نہیں۔ ایسا وزنی کہ اگر کسی کو اس سے پہلے، کوئی نیک کام کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو تو یہ ایک گراں بہا عمل، اس کے لئے جنت کا ضامن بن جائے۔ کیا آپ نے اس خوش بخت و فیروز مند عمرو بن ثابتؓ کا واقعہ نہیں سنا جو اسلام نہیں لایا تھا۔ غزوۂ احد کے دن، جب حق و باطل کی جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں۔ اس کے دل میں صداقت نے جوش مارا۔ مسلمان ہوئے تلوار ہاتھ میں لی۔ جانفروشانہ لڑے اور شہید ہو گئے۔ حضورؐ نے لاش کو دیکھ کر فرمایا کہ کس قدر خوش نصیب ہے یہ کہ جس نے کبھی ایک وقت کی نماز تک نہ پڑھی۔ لیکن سیدھا جنت میں جا پہنچا۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیئے قصے تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اس کے برعکس، ایسے تصادم کے وقت، جو لوگ اپنی جان کی حفاظت کے خیال سے میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھیں۔ ان کے متعلق تقدیر کے قاضی کا فیصلہ کیا ہے، اسے سننے سے پہلے، ذرا چشمِ تصور میں لائیے اس منظر کو کہ بدر کے میدان میں حق و باطل کا سب سے پہلا معرکہ درپیش ہے۔ حق کی مدافعت کے لئے، خود حضور نبی اکرمؐ کی قیادت میں، ان صحابہ کبارؓ کا لشکر صف آرا ہے جن کی شمعِ ایمانی ظلمت کدۂ عالم میں ہمارے لئے دلیلِ راہ اور مشعلِ ہدایت بنتی ہے۔ عین اس وقت جب کمانوں کے چلے چڑھائے جا چکے تھے، یہ تنبیہ خداوندی نازل ہوتی ہے کہ یاد رکھو!

میدانِ جنگ سے بھاگ جانیوالے

وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ (۸/۱۶) آج کے دن جو شخص بھی دشمن سے منہ موڑ کر بھاگے گا ۔۔۔ بجز اس کے کہ ایسا کرنا کسی جنگی ضرورت کے لئے یا اپنی دوسری پارٹی سے ملنے

کیلئے ہو ۔۔۔ تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ خدا کے غضب میں ماخوذ ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ اس کی عمر بھی کی نیکیاں سب غارت ہو جائیں گی۔ قرآن نے کہا کہ اس طرح میدانِ کارزار سے بھاگ کر تم مزید چند دنوں کے لئے سانس تو ضرور لے سکو گے لیکن اس ذلت کی زندگی میں جو جہنمی موت پوشیدہ ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷) اس تک ہر طرف سے موت اپنے خونی پنجے نکالے یلغار کرتی ہوئی آتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ مرتے بھی نہیں کہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ اس ذلت کی "مرگ آفریں زندگی اور اس عزت کی حیات آور موت میں جو فرق ہے" اسے اقبالؒ نے ان حقیقت کشا الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

کھول کے کیا بیاں کروں، سِرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

مرگِ باشرف اور حیاتِ بے شرف کا یہی وہ نازک ترین دوراہا تھا جس پر ہم نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، اپنے آپ کو اچانک کھڑے پایا تھا ۔۔۔ اُف! کیسا تھا وہ نازک مرحلہ اور کس قدر فیصلہ کن تھا ہمارے سفرِ حیات میں وہ دوراہا ۔۔۔ بال سے باریک؛ اور تلوار سے تیز، پُل صراط، کہ جس پر سے اگر ذرا سا بھی پاؤں پھسلے تو ساری کی ساری قوم تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا گرے۔ ہندو جیسا منتقم مزاج روباہ صفت، تنگ نظر اور انتہائی کینہ دشمن اٹھارہ برس کی مسلسل تیاری کے بعد، پاکستان سے پانچ گنا زیادہ تعداد کے لشکر اور بے محابا سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ، اعلانِ جنگ کئے بغیر، بے پناہ سیلابِ بلا اور بلادِ نگ آتشِ خاموش کی طرح، ایسے وقت میں ہماری سرحدوں پر آن کھڑا ہوا جب ہم سب، اطمینان اور سکون کی نیند سو رہے تھے ۔۔۔ لیکن میں نے غلط کہا ہے کہ ہم سب اطمینان کی نیند سو رہے تھے۔ ہم تو بے شک سو رہے تھے لیکن جنہیں جاگنے کی ضرورت تھی وہ جاگ رہے تھے۔ قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کو طائفین کی جماعت کہا ہے۔ طائف کہتے ہیں اس چوکیدار کو جو گشت کر کے پہرہ دے تاکہ سونے والوں کی جان، مال، عزت، آبرو، ہر خطرہ سے محفوظ رہے۔ ہم سو رہے تھے اور ہمارے طائفین کا گروہ جو مشتمل تھا افواجِ پاکستان کے جواں ہمت، جفاکش اور وفاکیش فرائض شناس اور جاں سپار جیالوں پر، جاگ کر پہرہ دے رہا تھا۔

۶ ستمبر کا دوراہا

شبِ زندہ دارانِ ملت

یہ ۵ اور ۶ ستمبر کی درمیانی رات ہی کو نہیں جاگ رہا تھا۔ یہ مسلسل اٹھارہ برس سے شب بیدار تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ہم سونے والوں نے کبھی اسے جاگتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ اس کی مسلسل اٹھارہ برس کی شب بیداری کی ریاضت کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد سترہ دن تک ایک لمحہ کے لئے بھی اس نے آنکھ نہیں جھپکی۔ اور یہ اپنی بندگانِ مولا صفات کی لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵) (نہ اُسے اونگھ آتی ہے نہ نیند) کا صدقہ تھا کہ ہم پھر اطمینان کی نیند سو سکے۔ آں خود آگاہ و خدا مست شب زندہ داران کی بیداریوں کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ ہمارے ٹینک رجمنٹ کے اس دفعدار کی قلبی کیفیت سے لگایئے جسے اس کے رفقاء "حافظ جی" کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ وہ حافظِ قرآن تھا ۔۔۔ حافظِ قرآن ہی نہیں بلکہ وہ میدانِ کارزار میں شمشیر بکف اپنے آپ کو محافظِ قرآن سمجھتا تھا اور بالکل بجا اور درست ایسا سمجھتا تھا۔ اس نے جنگ کے

بعد، وقائع نگار کو بتایا کہ سب سے پہلے جو ٹینک دشمن کے مقابلہ کو پہنچے وہ میرے ٹروپ کے تھے۔ میں اپنے ٹروپ کے ساتھ مسلسل پانچ روز تک اپنے ٹینک سے فائر کرتا رہا۔ ایک روز جب شاید تین دن اور تین راتیں کھڑے کھڑے فائر کرتے گذر چکی تھیں، میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرا دل

میں سو کیوں گیا

ڈوبنے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے تھام لیا اور گھبرا کر پوچھنے لگے کہ حافظ جی! کیا ہوا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا کہ میں کتنی دیر سویا تھا؟ انہوں نے کہا کہ آپ سوئے کہاں تھے، یونہی ذراسی اونگھ آئی ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور آپ ہوشیار ہو گئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ ایک آدھ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگی تھی تب مجھے اطمینان ہوا اور میرا رعشہ تھمنے لگا۔ حافظ جی نے رعشہ کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بہت دیر تک سویا رہا ہوں۔ اس احساس سے مجھ پر عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔ خیال آیا کہ کس مقدس فریضہ کی ادائیگی میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگر اس حالت میں میرا ٹینک ہٹ ہو جاتا تو میں حرام کی موت مر جاتا اور اگلے جہان جب خدا مجھ سے پوچھتا کہ بدبخت بندے! جب کفار میرے قرآن اور مساجد کی سرزمین میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو اس وقت تجھے نیند کیسے آ گئی تو میں کیا جواب دیتا؟ الحمد للہ کہ میں اس بازپرس سے بچ گیا۔ بس صاحب! اس کے بعد نہ بھوک محسوس ہوتی نہ نیند آئی۔ نہ یہ ہوش رہا کہ دشمن کی فوج کتنی زیادہ ہے۔ میں تھا اور خدا کی طرف سے اس پرسش کا خیال۔ اس کے بعد بھلا نیند کیسے آ سکتی تھی؟

موت اور حیات کی ایسی شدید کشمکش میں مستقل اقدار کے تحفظ کا احساس تھا جسے اس سادہ ذہن، پاکیزہ فطرت وفعدار نے خدا کی پرسش سے تعبیر کیا۔ یہی بلند کردار اور حسن سیرت کی بنیاد ہے۔ ان سترہ دنوں میں ساری دنیا محو حیرت تھی کہ اتنی تھوڑی سی فوج نے اس قدر کم اسلحہ اور سامان کے ساتھ، آتش فشاں پہاڑ کے اس آگ کے دریا کا مقابلہ کس طرح سے کیا ـــ اور صرف مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ اس قدر استخواں شکن شکست دی کہ ہندو کی آنے والی نسلوں کی ہڈیوں میں وہ چوٹیں وراثتاً منتقل ہوتی چلی جائیں گی اور اس کے بعد بھی اس پانچ سال میں ماہرین فن حرب، حسابی قاعدے جوڑ جوڑ کر تھک گئے ہیں لیکن انہیں اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا کہ ان مٹھی بھروں نے اس قدر مہیب کرگسوں دگدھوں کے پر کیسے نوچ ڈالے! اس سوال کا جواب حسابی قاعدوں سے نہیں مل سکتا۔ اس کا جواب، مستقل اقدار کی صداقت پر اس ایمانِ محکم سے ملے گا جس کی رو سے کہا گیا تھا کہ تمہارے دس مجاہد، دشمن کے سو پر اور بیس مجاہد اس کے دوسو پر بھاری ہوں گے۔ یہی جواب تھا جو امریکن میگزین ٹائم کے نامہ نگار لوئیس کرار کو ہماری فوج کے ایک افیسر کمانڈنگ نے دیا تھا۔ لوئیس نے ۲۲ ستمبر

لوئیس کرار کو جواب

۱۹۶۵ء کو لکھا تھا کہ میں نے اس افسر سے پوچھا کہ اس کا بالآخر راز کیا ہے کہ آپ اس قدر قلیل التعداد ہونے کے باوجود، ہندوستانیوں کو یوں مغلوب کئے جا رہے ہیں۔ اس افسر نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا، مسکرایا اور کہا کہ

اگر حوصلہ، جرأت وشجاعت ایسی اجناس ہوتیں جو بازار سے خریدی جا سکتیں تو

ہندوستانی انہیں امریکی امداد کے ساتھ حاصل کر لیتے ۔ (یہ متاعِ گراں بہا بازار میں نہیں مل سکتی ۔ یہ سپاہی کے جذبۂ ایمان میں پوشیدہ ہوتی ہے ۔)

صحیح ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

یہی وہ شاہین جگر اور جری القلب شیرانِ غاب ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ ۔ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا ۔ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ ۔ (۳ : ۱۷۲) یہ وہ ہیں کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ دشمن نے تمہارے خلاف ایک عظیم لشکر جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں ان سے ڈرنا چاہیئے تو اس سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور انہوں نے نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ ۔ خدا داریم ، چہ غم داریم ۔ وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ۔

اس اعتماد کی کیفیت اور قلت اور کثرت کے فریب تخیل کی حقیقت پوچھیئے میجر شفقت بلوچ (ستارۂ جرأت) سے جو اس فیصلہ کن شب کو ہڑیکے برکی سیکٹر پر، اپنی کمپنی کے صرف ایک سو

میجر شفقت بلوچ

جوانوں کے ساتھ متعین تھے ۔ رات کے تین بجے انہوں نے ایک پورے بریگیڈ کو جو ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح تھا، پاکستان کی طرف بڑھتے ہوئے پایا۔ میجر شفقت نے فوراً محسوس کیا کہ عظیم آزمائش کا تاریخی مرحلہ سامنے آگیا ہے ۔ آسمان کی آنکھ نے جرأت و بسالت کا ایسا محیر العقول کارنامہ بہت کم دیکھا ہو گا جب ایک سو مجاہد، ایک پورے بریگیڈ (قریب تین ہزار کے لشکرِ مہیب) پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے ان کے ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور بھارتی سورماؤں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ دشمن بار بار از سرِ نو منظم ہو کر پوری قوت سے حملہ آور ہوا، لیکن میجر شفقت اور ان کے یہ جانباز آہنی دیوار کی طرح اس کے سامنے ڈٹے رہے ۔ انہوں نے مسلسل نو گھنٹے تک آگ اور خون کے اس سیلاب کا مقابلہ کیا تا آنکہ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا۔

جنگِ ستمبر کے طارقِ اولؔ میجر شفقت اور اس کے جانباز رفیقو! پاکستان کی سالمیت تمہیں جھک کر سلام کہتی ہے ۔

کہا جائے گا کہ اپنے ملک کی حفاظت، فوج کا فریضہ ہوتا ہے جس کے لئے عند الضرورت جان بھی دینی پڑتی ہے

محض فرائض کی ادائیگی نہیں

اس لئے ہماری افواج نے جو کچھ کیا وہ ان کے فریضہ کی ادائیگی تھی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی حفاظت فوج کا فریضہ ہوتا ہے لیکن جان دینے کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے بھی جس قدر بلند جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے بالمقابل بھی ایک فوج تھی اور اپنے ملک کے عسکری عزائم کا بروئے کار لانا (خواہ وہ ہمارے یا دنیا کے نقطۂ نگاہ سے کیسے ہی مذموم کیوں نہ ہوں) ان کا بھی فریضہ تھا لیکن انہوں نے جس انداز سے اس فریضہ

کوادا کیا اس کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹ گیا تھا حالانکہ ان کے ارباب حل وعقد نے اس پر اتنے دبیز پردے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ بھارت میں ایک ممتاز اینگلو انڈین ہیں ـــ مسٹر فرینک انتھونی ـــ بار ایٹ لاء،

فرینک انتھونی کا انکشاف

بھارت پارلیمان کے رکن اور وہاں کی دفاعی کونسل کے ممبر۔ انہوں نے جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ریکارڈ کی بڑی دقت نظر سے چھان بین کی۔

۲۹ اپریل ۱۹۶۶ء کا ذکر ہے کہ بھارت پارلیمان میں کوئی رپورٹ زیر نظر تھی جس کے ضمن میں وہاں کی وزارت دفاع نے، حسب معمول اپنی افواج کے کارناموں کی فرضی داستانیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنی شروع کیں جب بحث میں کافی گرمی پیدا ہو گئی تو مسٹر انتھونی خاموشی سے اپنی نشست سے اٹھے اور اپنی تحقیقات کے نتائج کو بھری بزم میں اس انداز سے کھول کر رکھ دیا کہ ارباب حکومت کا رنگ زرد اور چہرے فق ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ

> لاہور کی دہلیز پر بھارتی فوج کے کم از کم دس ہزار سپاہی اور چار سو افسر ہلاک ہوئے ہماری گیارھویں کور کو ۶ ستمبر کی شام کو لاہور کے جم خانہ میں جام شراب نوش کرنے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ اس کور کے گیارہ بریگیڈیئر نااہل ثابت ہوئے اور نو بلٹنیں ناکارہ نکلیں۔ حتیٰ کہ چند ایک ڈویژن کمانڈر (میجر جنرل) بھی بزدل اور بھگوڑے ثابت ہوئے اور تماشہ یہ کہ ان جرنیلوں کو جو میدان جنگ سے پیچھے میل پیچھے دبک کر بیٹھے تھے، مہا ویر چکر کا بلند ترین اعزاز عطا کیا گیا۔

یہ تھا وہ انداز جس سے اُس فوج نے اپنے فرائض کی ادائیگی کی تھی۔ اس کے برعکس، اِدھر یہ عالم تھا کہ اگر کسی کی ڈیوٹی ایسی تھی جس میں جان کا خطرہ نہیں تھا اور اس کے سامنے اگر کوئی ایسا مقام آیا جس میں جان دے کر کسی مورچے کو بچایا جا سکتا تھا اور وہاں کا ڈیوٹی بردار شہید ہو چکا تھا تو یہ لپک کر اس آگ میں کود گیا اور ہنسی خوشی جان دے کر دوسروں کو خطرہ سے بچا لیا۔ میں (عزیزان من!) یہ کہہ رہا ہوں اور میری چشم تصور کے سامنے محاذ کھیم کرن کا شہید اول، میجر خادم حسین آ رہا ہے۔

میجر خادم حسین

ان کی ڈیوٹی اگلے مورچہ کو گولہ بارود کا سامان پہنچانا تھا۔ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ایک طرف کو جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ پاکستان کے ایک اہم مورچہ کا توپچی شہید ہو چکا ہے اور دشمن کے ٹینک تیزی سے ان مورچوں کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ میجر خادم حسین نے محسوس کیا کہ اگر دشمن کے ٹینک ان مورچوں تک پہنچ گئے تو اس سے ہمیں بہت بڑا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ وہ رکا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس مورچے میں کود پڑا اور توپ سنبھال لی۔ بھارتی ٹینک بہت قریب پہنچ گئے تھے کہ مورچے سے پہلا دھماکا ہوا اور پہلے ہی نشانے سے دشمن کے ٹینک کے پرخچے اڑ گئے۔ دوسرے گولے نے دشمن کا دوسرا ٹینک تباہ کر دیا۔ لیکن اتنے میں تیسرا ٹینک مورچہ پر چڑھ آیا اور میجر خادم حسین کو مع مورچہ کے کچل دیا۔ لیکن اتنے میں لڑائی کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ پاکستان کے شہباز دشمن کے ٹینکوں پر جھپٹ پڑے تھے۔ میدان صاف ہوا تو پلاٹون کمانڈر حیات، یہ معلوم کرنے کے لئے لپک کر آگے بڑھا کہ یہ معجزہ کس "فرشتے" نے سرانجام دیا تھا! لیکن ٹینک کے نیچے کچلی ہوئی

لاش کو اس وقت کون شناخت کر سکتا تھا؟ بعد میں پتہ چلا کہ وہ فرشتہ میجر خادم حسین تھا۔ خادم حسین اپنا سامان لئے محفوظ چلا جا رہا تھا۔ مورچہ کی توپ چلانا اس کے فرائض میں داخل نہیں تھا اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ مورچہ میں جانا، اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہے۔ سوچئے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے ہمارے اس جانباز کو "بے خطر آتشِ نمرود میں کود جانے" پر آمادہ کر دیا؟

خادم حسین! سرزمینِ پاکستان، جسے تو نے جان دے کر سرفرازی کے قابل بنا دیا، اپنی جبینِ نیاز سے تجھے احترام آمیز سلام کہتی ہے۔

ایک کمپاؤنڈر

اور اس سلام کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے، فیلڈ ایمبولینس کور کا وہ کمپاؤنڈر آتا ہے جس کے خون کی رنگینی سمائے ملت کی افق تابی کا موجب بنی۔ ایمبولینس کور کے جوانوں کا کام لڑنا نہیں ہوتا، زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ جنگ کے دوران ایک دن کا ذکر ہے کہ بی۔آر۔بی کے کنارے گھمسان کا معرکہ تھا۔ نہر کے اُس پار ہمارے کچھ سپاہی رائفلیں سنبھالے، دشمن کی یلغار کو روک رہے تھے۔ نہر کے اِس کنارے، فیلڈ ایمبولینس کور کے ایک کمپاؤنڈر نے دیکھا کہ ہمارا ایک سپاہی شہید ہو گیا ہے اور اس طرح حملہ روکنے والی دیوار میں شگاف پڑ گیا ہے۔ وہ نوجوان ادھر تھا۔ درمیان میں تند و تیز نہر تھی جسے دشمن کے سپاہی ہزار کوششوں کے باوجود سترہ دن تک عبور نہیں کر سکے تھے۔ ہم دیکھتے کیا ہیں کہ اس کمپاؤنڈر نے چھلانگ لگائی اور نہر کی موجوں سے ٹکراتا ہوا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ اپنے بازو پر لگے ہوئے ریڈ کراس کے نشان کو نوچ کر پھینک دیا اور دو ہی ثانیہ میں اُس شہید سپاہی کی رائفل سنبھالے، اس بنیانِ مرصوص کے شگاف کو پُر کرنے کے لئے صف آراء ہو گیا۔ یہ وہ معرکہ تھا جس میں بھارتی فوج کے میجر جنرل نرنجن پرشاد کو اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ معرکہ سر ہونے کے بعد جب پلٹن کے جانی نقصان کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ایک نفری زیادہ تھی۔ یہ اضافہ ایمبولینس کور کے اسی جانباز نے کیا تھا جس نے اقبال کے اس تخیل کو حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس طرح جانتے بوجھتے، دیکھتے بھالتے، خطرہ کی آگ میں کود کر جان دے دینا، فرائض اور ضابطہ کی پابندی سے ماوراء جذبہ کی بنا پر ہی ممکن ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ یہ واقعات کچھ پہلی دفعہ آپ کے سامنے نہیں آ رہے۔ انہیں آپ اس سے پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اوروں سے تو ایک طرف، خود میں نے بھی انہیں گزشتہ برسوں کی اسی تقریب میں کئی بار دہرایا ہے اور پھر یہ طلوع اسلام میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت ہے[1]۔ تاکہ ہماری وہ نسلیں جنہوں نے اس فیصلہ کن

---

[1] قرآنِ کریم نے حق و باطل کے تاریخی معرکوں کو اسی مقصد کے لئے بار بار دہرایا ہے۔

معرکہ کو دیکھا نہیں، جائیں اور پہچان لیں کہ وہ کون تھے جن کے متعلق، واگہ سرحد کی طرف جاتے ہوئے راستے میں شہداء کی یاد میں ایستادہ ایک سادہ سے مینار پر یہ درخشندہ و تابندہ الفاظ منقوش ہیں کہ

"ہم نے تمہارے کل کی حفاظت کے لئے اپنا آج قربان کر دیا ہے"

ٹینک رجمنٹ کا ڈرائیور

انہی میں ہماری ٹینک رجمنٹ کا ایک ڈرائیور بھی تھا جس کا ٹینک ہٹ ہو چکا تھا اور وہ زخموں سے چور، اس شکستہ ٹینک کے سائے میں بیہوش پڑا تھا۔ ادھر سے گزرتی ہوئی ایک پلٹن کے ایک نائک نے اسے دیکھا تو وہ اس کے قریب گیا۔ اس میں ہنوز سانس باقی تھا۔ فیلڈ ایمبولینس کہیں دور تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے جھولے سے پٹی نکالی کہ اس کا خون پونچھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ میں پانی ٹپکایا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے بیٹھے ہو؟ نائک نے واقعہ بتایا تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے کہا کہ گرائیں! مجھے چھوڑ دو اور اپنی پلٹن کے ساتھ ایڈوانس کرو۔ وہ نائک کہتا ہے کہ اس نے اس کی بات اَن سنی کر دی اور اس کے زخموں پر پٹی باندھتا رہا۔ اس نے دوبارہ آنکھ کھولی اور معلوم اس دفعہ اس میں اتنا جوش کہاں سے آگیا تھا کہ گرجتی ہوئی آواز سے کہا کہ معلوم نہیں تم کس بے غیرت پلٹن کے نائک ہو۔ دشمن یلغار کر رہا ہے۔ تمہاری پلٹن آگے بڑھ رہی ہے اور تم عورتوں کی طرح میرے سرہانے بیٹھے مرہم پٹی کر رہے ہو۔ دوست۔ اٹھو۔ لپک کر آگے بڑھو۔ میرے بچانے کی فکر نہ کرو، پاکستان بچانے کی فکر کرو۔ وہ بچ گیا تو سب کچھ بچ جائے گا۔

نائک آگے بڑھ گیا۔ دشمن پسپا ہو گیا۔ واپسی پر دیکھا تو وہ زخمی شہید ہو چکا تھا۔ اس کی وردی خون میں لت پت تھی اور اس کی پیشانی پر ہنوز وہ شکنیں باقی تھیں جن سے اس نے نائک کو ڈانٹا تھا۔ یہ اس کے ماتھے کی شکن نہیں تھی، گراموفون ریکارڈ کی وہ لکیریں تھیں جن میں ان جانثاروں کی اُن محیر العقول کارناموں کی داستانیں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی تھیں، جنہیں دیکھ کر آسمان کے فرشتے عش عش کر اٹھتے اور ان پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے تھے۔

مسجودِ ملائک آدم

تخلیقِ آدم کی تمثیلی داستان میں، جب ملائکہ نے خمیرِ آدم میں آگ کی چنگاریوں اور خون کے چھینٹوں کو مضمر دیکھ کر کہا تھا کہ بار الہا! تو اسے خلیفہ فی الارض بنا رہا ہے مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (یہ) جو زمین میں خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں کرے گا تو ارشادِ خداوندی نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ اِنِّىْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے" اولادِ آدم کے یہی وہ حیرت انگیز کارنامے ہیں جنہیں دیکھ کر ملائکہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے خدائے علیم و خبیر! ہمیں اپنے عجز کا اعتراف ہے کہ ہماری نگاہ آدم کی ان مضمر صلاحیتوں کو دیکھ نہیں سکتی تھی جن کی بنا پر یہ مسجود ملائک قرار پایا تھا۔ اس وقت ہم نے تعمیلِ ارشاد میں سجدہ کیا تھا۔ آج ہم علیٰ وجہ البصیرت آدم کے حضور احتراماً سجدہ ریز ہیں۔

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

لیکن میں عظمتِ آدم کی اس آسمانی تفسیر میں کھو کر، کہیں اس سرفروش کی ایمان افروز داستان کو بھول نہ جاؤں

اسے میں لے لوں گا

جس نے اس خطۂ ارض پر اقدار کے تقابل سے اس راز کو افشا کر دیا کہ کس طرح، بڑی قدر کی خاطر چھوٹی قدر کو قربان کر دیا جاتا ہے؛ اور اس طرح نفع و نقصان کے نئے پیمانوں سے عالمِ انسانیت کو آگاہ کر دیا۔ یہ بیان ہماری ٹینک رجمنٹ کے ایک لانس نائک کا ہے۔ اس نے کہا کہ لڑائی کا تیسرا دن تھا اور معرکہ ایسا گھمسان کا کہ جنگِ دست بدست تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ میرا ٹینک ہٹ ہو گیا تو میں نے ایک مشین گن سنبھال لی۔ لیکن دشمن اتنا قریب تھا کہ اس نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہماری فوج کا ایک سپاہی جسے میں قطعاً نہیں پہچانتا تھا، میرے قریب آ کر لیٹ گیا۔ اور کہنے لگا کہ وقت بہت نازک ہے۔ دشمن کے ہینڈ گرنیڈ تمہارے قریب آ کر پھٹ رہے ہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرتے جاؤ۔ اگر کوئی ہینڈ گرنیڈ تمہارے قریب آ کر گرا تو اُسے میں لے لوں گا۔ نائک نے کہا کہ میں سمجھ گیا کہ اس نے جو کہا ہے کہ "گرنیڈ کو میں لے لوں گا" تو اس سے اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پاگل ہو رہے ہو۔ تم اپنی جان بچاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اس نے کہا کہ گرائیں! بات میری اور تمہاری حفاظت کی نہیں۔ میرے پاس صرف ایک رائفل ہے اور تمہارے پاس مشین گن ہے۔ اس وقت زیادہ ضرورت مشین گن کی ہے میں مارا گیا تو ایک رائفل خاموش ہو جائے گی۔ اور تم مارے گئے تو ایک مشین گن بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے ......

وہ اتنا کہنے پایا تھا کہ ایک گرنیڈ میرے قریب آ کر گرا۔ وہ سپاہی کوندے کی طرح لپکا اور دھڑام سے گرنیڈ کے اوپر جا گرا۔ اس کے گرتے ہی گرنیڈ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بوٹیاں فضا میں اڑ گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ادھر یہ ہوا اور ادھر ہمارے سپاہیوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا اور اس کے بعد کوئی گرنیڈ ان کی طرف سے نہ آیا۔

وہ نائک یہ واقعہ سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ نہ مجھے اس جانثار کا نام معلوم ہے نہ پلٹن کا اتا پتہ ——— پروانوں کا نام اور مقام کسے معلوم ہو سکتا ہے؟ اگر مجھے کم از کم اس کے گاؤں ہی کا پتہ مل جاتا تو میں اس خوش بخت کی "بھاگاں والی" (صاحبِ نصیب) ماں کے پاس جاتا، اس کے قدموں کی خاک چومتا اور ہزار ہزار مبارک باد کے ساتھ کہتا کہ ——— دھن بھاگ ہیں ایسی مائیں جو اس قسم کے سپوت جنتی ہیں ——— یہی ہیں وہ سپوت جنہیں چشمِ تصور میں لاتے ہوئے اقبالؔ نے کہا تھا کہ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اس قسم کے واقعات، عزیزانِ گرامی قدر! اتنی کثرت سے ہیں کہ میں انہیں سناتا جاؤں تو رات ختم ہو جائے لیکن یہ داستانیں ختم نہ ہوں۔ قلتِ وقت کے پیشِ نظر، مجھے شجاعت و بسالت کے ان حیرت انگیز واقعات سے ہٹ کر اس جوہرِ انسانیت کی بھی دو ایک مثالیں پیش کرنی ہیں جس کے بغیر اس قسم کی بے لوث قربانیاں ——— جن میں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلہ کی امید ——— ظہور میں آ ہی نہیں سکتیں۔ ہم تاریخ

میں پڑھا کرتے تھے کہ ایک دفعہ جب محمود غزنوی کی فوج، فاتح و منصور وطن واپس گئی تو ایک بڑھیا فوجیوں کے

بڑھیا کا بیٹا

پاس آئی اور ان سے اپنے جوان بیٹے کے متعلق پوچھا جو ان کے ساتھ فوج میں گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا بیٹا میدانِ جنگ میں کام آ گیا تھا۔ اس پر بڑھیا نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا تو انہوں نے ازراہِ تفنن کہا کہ میدان سے بھاگ رہا تھا، پیچھے سے اس کے تیر لگا اور وہ مر گیا۔ اس پر بڑھیا نے پورے حتم و یقین کے ساتھ کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ وہ کبھی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نہیں سکتا۔ تیر اس کی پیٹھ میں نہیں، سینے میں لگا ہوگا۔ بات افسر تک پہنچی تو اس نے بڑھیا سے کہا کہ تم تو میدانِ جنگ میں ساتھ نہیں تھیں۔ تم اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کس طرح کہہ سکتی ہو کہ تیر اس کی پشت پر نہیں سینے پر لگا تھا۔ اس پر اس نے کہا کہ میں نے ایسے دودھ کا ایک قطرہ اس کے حلق میں نہیں ٹپکایا جو رزقِ حلال سے پیدا نہ ہوا ہو۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسا بچہ میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھے۔ چنانچہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بڑھیا ٹھیک کہتی تھی۔ اس کے بیٹے نے سینے پر زخم کھا کر ہی جان دی تھی۔

آج جب کہ ہمارے ہاں رزقِ حلال کے صرف الفاظ باقی رہ گئے ہیں، ہماری نئی نسلوں کے نوجوان شاید یہ

رزقِ حلال و حرام

نہ سمجھ سکیں کہ رزقِ حلال سے کس قدر پاکیزہ جوہروں کی نمود ہوتی ہے اور رزقِ حرام کس طرح انسانیت ساز صلاحیتوں کو بھسم کر کے رکھ دیتا ہے۔ جو بچے بناسپتی گھی کے اس قدر خوگر ہو چکے ہوں کہ خالص گھی سے ان کے حلق میں خراش ہونے لگ جائے، انہیں کیسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ خالص گھی کس قسم کی توانائیاں پیدا کیا کرتا ہے۔ اور جس معاشرہ میں "خالص اور ناخالص" تک کی بھی تمیز اٹھ گئی ہو، اس میں حلال اور حرام کا امتیاز کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ ان حالات میں ہم رزقِ حلال و حرام کے نتائج کی بحث میں تو نہیں جا سکتا، البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جن گھرانوں میں ہنوز مستقل اقدار کا چرچا ہوتا رہتا ہے، ان میں تربیت یافتہ بچوں کے تحت الشعور میں ان اقدار کی اہمیت ضرور جاگزیں ہوتی ہے اور جب شدت کا معرکہ درپیش ہو تو وہ ابھر کر سامنے آ جاتی ہے اور اس سے ایسی حسین و جمیل صفات کی نمود ہوتی ہے جو فضا کی تاریکیوں میں سپیدۂ سحر بن کر چمک اٹھتی ہیں۔ ایسی ہی تبسم فروش و عطر بیز بے ساختہ ادائے دل فروز کا مظاہرہ برکی کے محاذ پر میجر عزیز بھٹی سے ہوا جس کا راوی، ان کا کوارٹر ماسٹر اکرام ہے۔ اس

میجر عزیز بھٹی

نے بتایا کہ جب راجہ صاحب، تین دن اور تین راتوں تک مسلسل کھڑے، دشمن کا مقابلہ کرتے رہے، اور میں نے دیکھا کہ چوروٹی میں ان کے کھانے میں ڈال آتا ہوں وہ اسی طرح پڑی سوکھتی رہتی ہے، اس میں سے میجر صاحب نے ایک لقمہ بھی نہیں توڑا ہوتا تو ۱۳ ... تو مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میجر صاحب کو میٹھی پوریاں بہت پسند تھیں۔ میں نے نہایت لذیذ پوریاں تیار کرائیں اور انہیں لے کر میجر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پوریاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کھڑے کھڑے ایک پوری اٹھائی ... اس میں سے ایک لقمہ توڑا۔ اور ساتھ ہی پوچھا کہ کیا سارے جوانوں کو اسی قسم کی پوریاں دی گئی ہیں۔ میں نے کہا کہ آج تو ان کے لئے اس کا انتظام نہیں ہو سکا۔ کل ایسا کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر میجر بھٹی نے وہ پوری ہاتھ سے رکھ دی اور کہا کہ پھر میں بھی کل ہی پوریاں کھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میجر پوریاں کھائے اور اس کے جوان سوکھی روٹی پر گزارہ کریں۔

یہ سنکر مجھے، عزیزانِ گرامی قدر! چودہ سو سال پہلے کی اپنی تاریخ کا وہ واقعہ یاد آگیا کہ جب حضرت ابو عبیدہ رضؓ فاتح کی حیثیت سے عراق پہنچے تو وہاں کے سرداروں نے آپ کی دعوت کی جس میں انواع و اقسام کے کھانے دسترخوانوں پر چنے گئے۔ آپ نے ان کھانوں کو دیکھا اور پوچھا کہ کیا یہ کھانے، بالخصوص ان کے لئے تیار کئے گئے ہیں یا ساری فوج کو وہی کچھ دیا گیا ہے۔ جب جواب نفی میں ملا تو آپ نے یہ کہہ کر کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ ہمارے ہاں سپاہی اور سپہ سالار میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ میں اس وقت تک ان کھانوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا جب تک میری ساری فوج ان میں شریک نہیں ہو گی۔

اور یہی تھا ہماری اس قدر عظیم القدر، محیر العقول کامیابی کا وہ راز جس کا انکشاف مجھ پر، چونڈہ کے محاذ پر ایک کرنل نے کیا۔ وہ ہمیں میدانِ جنگ کے سب سے اگلے مورچے دکھا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان مورچوں میں سپاہی تھے یا افسر بھی۔

محاذِ چونڈہ کا معرکہ

انہوں نے کہا کہ جنگ کا عام نقشہ یہی ہوتا ہے کہ سب سے آگے سپاہی ہوتے ہیں اور ان کے بعد جوں جوں افسر کا رینک (RANK) بڑھتا جاتا ہے، ان کا مقام پیچھے ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جرنیل سب سے پیچھے بیٹھ کر ہدایات نافذ کرتا ہے۔ لیکن ہم نے جنگ کی بساط الٹ دی تھی۔ ہمارے جرنیل۔ برگیڈیر کرنیل وغیرہ سب سپاہیوں کے ساتھ اگلے مورچوں میں تھے۔ اس طرح محمود و ایاز کے عملاً ایک صف میں کھڑے ہو جانے کا جو نتیجہ نکلا اس نے جنگ کے تمام حسابی قاعدوں کو الٹ کر رکھ دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ علاوہ دیگر امور، یہ سوچئے کہ اگر کوئی افسر میدانِ جنگ میں مارا جائے تو سپاہی اس کی لاش لینے کے لئے اپنی جانیں تک دے دیتے ہیں۔ تو جو سپاہی افسر کی لاش کے لئے جان دے دیں وہ اپنے افسر کی زندگی کے لئے، جو ان کے ساتھ مورچے میں کھڑا ہے کیا کچھ نہیں کر گذریں گے۔ چنانچہ ہمارے ان جوانوں نے وہ کچھ کر دکھایا جس پر ہم خود حیران تھے۔

میں نے کرنیل صاحب سے کہا کہ آپ نے اس جنگ میں جو بساط الٹی ہے تو یہ سنتِ رسول اللہ کے اتباع میں تھا۔ کیونکہ نبی اکرمؐ میدانِ جنگ میں خود مجاہدین کی پوزیشن کا تعین فرماتے تھے۔ اور قلبِ لشکر میں سب کے ساتھ خود شریکِ کارزار ہوتے تھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور کرنیل صاحب اور ان کے ساتھیوں کی آنکھیں نم آلود ہو رہی تھیں۔ یہ آنسو اس مسرت کے تھے کہ انہیں، اسوۂ رسول اللہ کے اتباع کی بھی سعادت نصیب ہو گئی۔

پاکیزگیٔ سیرت

اور اس سے بھی بڑھ کر، ہمارے مجاہدین کی پاکیزگیٔ سیرت کی وہ عدیم المثال نمود تھی جس کا اعتراف دشمن کو بھری مجلس میں کرنا پڑا۔ یہ مقولہ تو آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ (EVERY THING IS FAIR IN LOVE AND WAR) جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، اور اس جواز کے بعد، فاتح فوج کے سپاہی جو کچھ مفتوحہ علاقہ میں جا کر کرتے ہیں، اس کے تصور سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ جنگِ ستمبر میں ہماری افواج کے سپاہی فاتحانہ حیثیت سے، دشمن کے علاقوں میں داخل ہوئے۔ وہاں کی آبادی میں عورتیں بھی تھیں۔ لیکن انہوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس کا جواب ہم سے نہیں، بھارت کے وزیرِ دفاع، چون کی زبان سے سنیئے۔ اس نے بھارت کی پارلیمان میں، ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ

اس سترہ روزہ جنگ میں کوئی ایسا واقعہ ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نظروں سے بھی دیکھا ہو۔

اور ہماری افواج کے ان پاک بازو پاک بین مجاہدین کا یہ طرز عمل کس قوم کی عورتوں کے ساتھ تھا؟ اس قوم کی مستورات کے ساتھ، جس کے سپاہیوں کا اسی جنگ میں ہماری بہو بیٹیوں کے ساتھ جو سلوک تھا اس کیلئے میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا جس کے راوی کرنل سیال ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۰ ستمبر کی شام میں کیمپ میں بیٹھا تھا کہ ایک بوڑھا سا آدمی اور اس کے ساتھ ایک بڑھیا میرے پاس آئے جیسے کسی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ہوں۔ اس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ہی اس رجمنٹ کے کمانڈر ہیں۔ جب میں نے ہاں کہا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بڑھیا بے ساختہ میرے پاؤں پر گر پڑی۔ میرے بوٹوں کی مٹی اپنے ہاتھوں پر ملی اور اسے اپنے سر آنکھوں سے لگایا۔ مجھ پر تو یوں سمجھو جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ میں نے اُسے جھٹ سے اٹھایا اور کہا کہ تم تو میری ماں ہو۔ تم نے یہ کیا کیا؟ اس کے ساتھی بوڑھے نے کہا کہ یہ آپ کو میں بتاتا ہوں کہ اس نے کیا کیا ہے۔

ہڈیارہ کی بڑھیا

واقعہ یہ ہے کہ جب ۸ ستمبر کی صبح، دشمن نے ہمارے گاؤں، ہڈیارہ کو خالی کرایا ہے تو وہ گاؤں کی آبادی کو ہانک کر باہر لے گئے۔ انہوں نے ہم مردوں کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے، بوڑھی عورتوں کو ایک طرف کھڑا کر کے کہہ دیا کہ انہیں گولی سے اڑا دیا جائے اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کو الگ کر کے حکم دیا کہ انہیں سرحد کے پار لے جا کر سپاہیوں میں بانٹ دیا جائے۔ ہم میں سے ایک آدمی نے ان سے کہا کہ یہ تمہاری انتہائی مکینگی ہے۔ ہم مردوں کے ہاتھ کھول دو تو ہمیں کم از کم اس کی تو تسکین ہو جائے کہ ہم نے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر جان دے دی۔ اس پر دشمن کے ایک سپاہی نے بندوق کا کندہ مار کر اس کا جبڑہ توڑ دیا۔ وہ درندے ہماری معصوم بچیوں اور باعصمت عورتوں کی طرف لپکے۔ اس وقت ہماری بے کسی کا یہ عالم تھا کہ زمین کانپ رہی تھی۔ آسمان تھرتھرا رہا تھا۔ وہ بچیاں بے ساختہ سجدوں میں گر گئیں اور درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز سے کچھ اس طرح سے خدا سے فریاد کی کہ ہمیں محسوس ہوا گویا خدا کا عرش کانپ اٹھا ہے کہ اتنے میں ادھر سے ایک گولہ آیا اور اس نے دشمن کی فوج میں بھگدڑ مچا دی۔ میدان خالی ہو گیا تو عورتوں نے ہمارے ہاتھ کھولے اور ہم انہیں لے کر بحفاظت نہر کے پار پہنچ گئے۔ یہ بڑھیا، جسے یوں سمجھو کہ اُن سب کی نمائندہ ہے۔ دو دن سے اُس "فرشتے" کو ڈھونڈ رہی تھی جس نے ایسے وقت میں انہیں بچایا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے۔

عزیزان من! میں سمجھتا ہوں کہ ہڈیارہ کا یہ واقعہ جنگ ستمبر کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ اگر ہمارے ان جسور و غیور مجاہدین کے گولے بروقت آتش بار نہ ہوتے تو پورا پاکستان ہڈیارہ بن جاتا۔ اُف! کس قدر ہوش رُبا ہے اس کا تصور!

جنگ ستمبر کے شہیدو اور غازیو! تم نے اپنے خون سے ملت پاکستانیہ کی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی حفاظت کی۔ ان باعصمت بیٹیوں اور بہنوں کی پاکیزہ دعائیں

تمہیں سلام کہتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے عزیزانِ من! کہ جس طرح جان کی حفاظت، حیوانی جبلّت کا شدید ترین تقاضا ہے۔ اسی طرح حفاظت

حفاظتِ عصمت

عصمت، انسانی زندگی کی گراں ترین مستقل قدر ہے۔ مومن کے سامنے جب عصمت کی حفاظت کا سوال آتا ہے تو اُس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی بھی اسکے نزدیک ہیچ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ "عصمت کی حفاظت" سے مراد اپنی عورتوں کی عصمت ہی نہیں، مومن کے نزدیک، دنیا کی ہر عورت کی عصمت یکساں واجب الاحترام ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت مومن کا فریضہ ہوتا ہے۔ جنگِ ستمبر میں ہمارے سرفروشوں نے جو اس قدر محیر العقول کارنامے کر دکھائے تو ان کا ایک بڑا محرک جذبۂ عصمت کی حفاظت بھی تھا۔ چنانچہ جب بلوچ رجمنٹ کے لانس نائک غلام مرتضےٰ سے ہسپتال میں پوچھا گیا کہ تم لوگ باٹاپور کی سرحد پر کھڑے لڑ رہے تھے۔ ملٹری (STRATEGY) کا تقاضا تھا کہ تم ذرا پیچھے ہٹ کر لڑتے۔ تم پیچھے کیوں نہ ہٹے۔ تو اس کے جواب میں اُس ان پڑھ سپاہی نے کہا تھا کہ ہم پیچھے کہاں ہٹتے پیچھے تو لاہور تھا اور لاہور میں ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں ہماری عزتیں اور آبروئیں لے کر بیٹھی تھیں۔ سرحد پر کھڑے ہو کر ان کی حفاظت کرتے یا ملٹری سٹریٹیجی کو دیکھتے۔ وہ وقت آگے بڑھنے یا کھڑے رہ کر جان دینے کا تھا۔ پیچھے ہٹنے کا نہیں۔

یہی تھا مفاظت کا وہ مقدس جذبہ جسے میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے ایک سپاہی نے، جس کے ہاتھوں میں تازہ مہندی رچی ہوئی تھی، اپنی زندگی کے آخری سانسوں میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ

ہاتھوں کی مہندی

میں چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا۔ میری شادی میں تین دن باقی تھے کہ جنگ کا اعلان ہو گیا اور مجھے فوری طور پر واپس آنا پڑا۔ میں گھر سے چلنے لگا تو میری والدہ اور ہمشیرہ نے اپنی خوشی پوری کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مہندی لگائی۔ میری منگیتر، جو ہمارے اپنے ہی گھر کی لڑکی تھی، لجاتی، شرماتی، گھونگھٹ نکالے آگے بڑھی اور اپنی انگلی کا ایک قطرۂ خون میری مہندی میں ٹپکا کر خاموش واپس چلی گئی۔ میں گھر سے روانہ ہوا تو پیچھے سے آواز آئی کہ میدان میں جانا تو پیچھے کا خیال نہ رکھنا ایسے وقت زندگی میں بہت کم آیا کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ آواز میری ماں کی تھی، بہن کی یا منگیتر کی تھی۔ لیکن اس نے میری رگوں میں بجلیاں دوڑا دیں۔ جنگ کے ہر محاذ پر وہ آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی تا آنکہ اللہ نے مجھے شہادت کا درجہ دے دیا۔ یہ میرے گاؤں کا پتہ ہے۔ اگر ہو سکے تو میری منگیتر تک میرا پیغام پہنچا دینا کہ میں نے تمہارے قطرۂ خون کی لاج رکھ لی ہے۔

اور کھیم کرن کے محاذ کے اس واقعہ کو کون بھلا سکیگا جسے میں کتنی بار بیان کر چکا ہوں اور کتنی بار دہراؤں گا۔ فوج کے سپاہی ایک گاؤں کے قریب سے گزرے تو گاؤں کی عورتیں باہر نکل آئیں۔ جمعدار کا بیان ہے کہ

بہنوں کے دوپٹے

بوڑھی عورتوں نے ہمیں دعائیں دیں۔ پاس ہی چند ایک جوان لڑکیاں بھی کھڑی تھیں۔ معلوم ان کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے اپنی چنیاں (دوپٹے) اتار کر سپاہیوں کی طرف پھینکیں اور کہا کہ "بھراؤ! بھیناں دیاں اینہاں چنیاں دی لاج رکھنا"۔ جمعدار نے

کہا کہ میرے سپاہیوں نے ان دو ٹوپیوں کو امانت کے طور پر اپنے پاس رکھا اور ہم جس جگہ بھی جنگ میں گئے اس امانت کی حفاظت ہمارے لئے جزوِ ایمان بن گئی۔ میری پلٹن کے تین سپاہی نہایت بے جگری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان دو ٹوپیوں کو اپنی فولادی ٹوپیوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

شہید عزیز کی بہن کا خط

اور یہی تھے بہنوں کے وہ جانثار بھائی، جن کی یاد میں، ان بہنوں نے، ان الفاظ کے ساتھ خاموش آنسو بہائے تھے۔ جنہیں، میجر عزیز بھٹی کی شہادت کے بعد، ان کی غمزدہ بہن نے، شہید بھائی کے نام اپنے خط میں یوں لکھا تھا کہ۔

میرے راجہ بھائی! میں گھر سے بہت دور تھی کہ تمہاری شہادت کی خبر سنی۔ وطن پر قربان ہونے والوں میں تمہارا نام آیا تو جانتے ہو تمہاری بہن پر کیا گزری؟ تم سوچتے ہوگے کہ میں نے تمہاری یاد میں سسکیاں بھری ہوں گی۔ نہیں بھیا! میں نے ایسا تو ہرگز نہیں کیا۔ میں نے تمہاری تصویر اٹھائی۔ اسے آنکھوں سے لگایا۔ اور پھر آپ ہی بے ساختہ میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

تو نے بہن کی لاج رکھ لی۔ بھیا تو کتنا بہادر نکلا۔

اور ہاں بھیا! میں روئی بھی تھی۔ رونا اس لئے نہیں آیا تھا کہ میں اپنے راجہ ویر کو اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ بلکہ آنکھیں اس لئے بھر آئیں کہ کاش میں تمہارے قریب ہوتی اور شہید بھائی کی پیشانی چوم سکتی۔

لوگ کہتے ہوں گے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں جو تم سے باتیں کر رہی ہوں۔ لیکن تم تو زندہ ہو اور ابد تک زندہ رہو گے۔ شہید کبھی نہیں مرتے۔ اچھا بھیا! خدا حافظ! اپنی بہن کی دعائیں قبول کرو۔

(تمہاری بہن۔ زیب رانی۔ کراچی)

شہیدوں کی یاد میں، ان الفاظ سے زیادہ دل گداز اور مؤثر الفاظ، نہ کسی بڑے سے بڑے سحر نگار ادیب کے قلم سے نکل سکتے ہیں، نہ کسی شعلہ نوا خطیب کی زبان سے۔ اس لئے میں بھی اس حسین و سادہ و رنگین داستان کو انہی الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

ایک سوال

لیکن اس داستان کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک سوال، پہلے اپنے آپ سے، پھر آپ احباب سے، اور آپ کی وساطت سے پوری ملت پاکستان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمارے ان شہدا کے گراں بہا خون کی یہی قیمت ہے جسے آج ہم اپنے معاشرہ میں اس طرح ادا کر رہے ہیں! ہمیں پاکستان جیسی عظیم مملکت ایک قطرۂ خون بہائے بغیر مل گئی تھی — یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے لاکھوں جانوں کی قربانی دی تھی، تو یہ دعویٰ حقیقت کے خلاف ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے جو کچھ ہمارے مہاجرین کے ہتھے قافلوں کے ساتھ کیا تھا، پاکستان اس سے پہلے حاصل کیا جا چکا تھا۔ اور وہ حاصل کیا جا چکا تھا ایک قطرۂ خون بہائے بغیر — یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس کی قدر نہ کی۔ بلکہ علامہ اقبالؒ نے تو اس

سے بہت پہلے، یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

پہلے اٹھارہ برس اسی طرح گذر گئے۔ ہمارے اللّوں تللّوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۶۵ء میں یہ مملکتِ خداداد ہاتھوں سے نکلے جارہی تھی کہ ہمارے جاں باز مجاہدوں نے، اپنے خون کی بے بہا قیمت ادا کر کے، اُسے از سرِ نو خرید کر ہمیں دے دیا لیکن اس پانچ برس کی مدت میں، ہم نے، تنابے ملت کے بخیے ادھیڑنے کے لئے، وہ کچھ کیا جو پہلے اٹھارہ برس میں نہیں کیا تھا۔ اس وقت کم از کم مملکت کی وحدت قائم تھی اور ایک مضبوط مرکز موجود جس کی وجہ سے دشمن کی یلغار کو روکنے کے لئے ہماری فوج اور اس کے پیچھے قوم، ایک آہنی دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔ لیکن اب اربابِ ملت کے 'خیر سے' عزائم یہ ہیں کہ مملکت کے حصے بخرے کر کے، اسے پانچ چھ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور مرکز کا وجود محض تبرکاً باقی رہ جائے۔ سوال یہ ہے کہ دشمن نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر جب پھر سے یلغار کی تو اس وقت کونسی دیوار اس کے راستے میں کھڑی ہوگی؟ یاد رکھیے! اس مملکت کی سالمیت اور حفاظت کا طریق وحدتِ پاکستان کے سوا کوئی نہیں۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو یہ مملکت محفوظ رہ سکے گی، ورنہ — ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں — لیکن ہماری داستان رہے یا مٹے، ان شہیدوں کی داستان کو زمانے کا کوئی حادثہ نہیں مٹا سکتا جنہوں نے اپنے خون کی قیمت سے حیاتِ جاوداں خریدی ہے۔ ان کی داستان، قرطاسِ زمانہ پر سورج کی سنہری کرنوں سے منقوش ہے۔ یہ مردِ مسلمان تھے۔ وہ مردِ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل

جنگِ ستمبر کے زمانے میں اگر اقبالؒ زندہ ہوتا تو وہ دیکھتا کہ اس نے اپنے "شاہین بچوں" کے ساتھ جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، انہوں نے انہیں کس حسن و رعنائی اور شانِ زیبائی سے پورا کر دکھایا اور اس کی حقیقت منتظر کو کس طرح لباسِ مجاز پہنا دیا — وہ مردِ دانا و بینا اپنے خوابوں کی اس تعبیر کو دیکھتا اور پھر ہمیں بتاتا کہ ان شہداء نے اپنے خون کی رنگینیوں سے ہمارے لئے کس قدر سامانِ سرخروئی فراہم کر دیا ہے جو حضرات اس زمانے میں موجود تھے انہیں یاد ہوگا کہ ۱۹۱۱ء میں، جنگِ طرابلس نے مسلمانانِ عالم کے کاشانوں پر کس طرح بجلیاں گرا دی تھیں۔ ان شہداء کی یاد میں، شاہی مسجد (لاہور) میں، ایک تاریخی اجتماع ہوا تھا جس میں حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی وہ شہرۂ آفاق نظم پڑھی تھی جو بانگِ درا میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے یہ منظر پیش کیا تھا کہ وہ عالمِ بالا میں گئے تو فرشتے انہیں بارگاہِ رسالتمآبؐ میں لے گئے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم خاکدانِ ارضی سے آئے ہو تو ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ اس پر اقبالؒ نے عرض کیا کہ

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

۱؎ یہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں کہا گیا تھا اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں مملکت کا آدھا حصہ ہاتھ سے نکل گیا۔ (طلوعِ اسلام)

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہماری سوختہ ساماں، متاع بردہ قوم کے پاس کوئی ایسی مایۂ ناز شے نہ تھی جسے ہم حضور رسالتمآب میں بطور نذرانہ پیش کر سکتے۔ شہدائے پاکستان کا ہم پر یہ احسان کس قدر گراں بہا ہے کہ انہوں نے اپنے مقدس خون کا وہ آبگینہ ہمیں عطا کر دیا جسے ہم دنیائے انسانیت کے سامنے بصد فخر و مباہات اور اس کے بعد بارگاہِ ختمی مرتبت میں بہ ہزار عجز و نیاز آبرو مندانہ طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

امت کی آبرو کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں دے دینے والے جنگِ ستمبر کے شہیدو! ہمارے سرِ مژگان چمکنے والے ستاروں کا ہدیۂ محقر قبول کرو کہ ہمارے پاس اس سے زیادہ تابندہ کوئی متاع ایسی نہیں جو تمہارے شایانِ شان ہو۔

والسلام

اراکین احباب کو اپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی،

متوجہ ہوں!

سوسائٹی کے اراکین کے جو پتے دفتر میں موجود ہیں، ان پر بھیجی ہوئی اکثر چٹھیاں، اس ریمارک کے ساتھ واپس آجاتی ہیں کہ مکتوب الیہ لاپتہ ہے۔ سوسائٹی کی زمین کا مسئلہ اب آخری مرحلہ میں پہنچ رہا ہے جس کیلئے ضروری ہے کہ اراکین کے موجودہ ٹھیک ٹھیک پتے سوسائٹی کے دفتر میں موجود ہوں تاکہ اراکین سے رابطہ پیدا کرنے میں دقت نہ ہو۔ لہٰذا التماس ہے کہ سوسائٹی کے اراکین اپنے موجودہ پتوں سے بہت جلد مطلع فرما دیں۔ شکریہ!

سیکرٹری احباب کو اپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی
۲۵/بی۔ گلبرگ نمبر ۲۔ لاہور

لاہور میں قیام کیلئے

صاف ستھرے، ہوادار کمرے مناسب شرح پر، نیز عمدہ لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کیلئے

معیاری طعام گاہ

PARK-WAY

پارک وے ہوٹل

فون نمبر ۵۷۲۵۹

آپ کی تشریف آوری کا شکریہ!

مینیجر پارک وے ہوٹل،
نزد ریلوے اسٹیشن۔ لاہور

ختمِ نبوّت

اور

تحریکِ "احمدیّت"

توقع تھی کہ پرویز صاحب کی یہ کتاب، جس کا مدت سے انتظار چلا آرہا ہے، ۱۵ ستمبر کے بعد شائع ہو جائے گی۔ جب "فرقہ وارانہ لٹریچر" کے متعلق حکومت کی طرف سے عاید کردہ پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ لیکن ان پابندیوں میں ۳۰ ستمبر تک کی توسیع کر دی گئی ہے۔ کتاب چھپنے کے لئے تیار رکھی ہے۔ اگر ان پابندیوں میں مزید توسیع نہ کر دی گئی تو یہ وسط اکتوبر تک شائع ہو جائے گی۔

(۲) اگرچہ مسئلہ "احمدیت" کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن اس کتاب کی اہمیت بدستور قائم ہے بلکہ اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ "احمدیوں" کی طرف سے دھڑا دھڑ لٹریچر شائع ہو رہا ہے جس میں (حقیقت کو چھپا کر) یہ بتایا جاتا ہے کہ ہم تو پکے اور سچے مسلمان ہیں۔ ہمیں دھاندلی سے غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بتائے گی کہ ان کی اصلیت کیا ہے اور یہ کس طرح مسلمانوں کو دھوکا دیتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں خود "احمدیوں" کی تحریروں سے ان کی اصلیت اور عزائم کو سامنے لایا گیا ہے۔ اور متانت اور سنجیدگی کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔

اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہمارے علماء حضرات، ان کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں میں ان سے کیوں مات کھا جاتے ہیں، اور وہ دلائل کون سے ہیں جن کا ان کے ("احمدیوں" کے) پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہماری تاریخ میں باب نبوت کس طرح کھولا گیا۔ مرزا غلام احمد نے اس سے کس طرح فائدہ اٹھایا اور اسے ہمیشہ ہمیش کے لئے بند کرنے کی صورت کیا ہے؛

غرضیکہ یہ کتاب مسئلہ ختم نبوت پر مستند، علمی، تحقیقاتی صحیفہ ہے جسے جذبات سے یکسر الگ ہٹ کر منضبط کیا گیا ہے۔ اور جس کے بعد، اس مسئلہ پر کسی اور کتاب کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اب اس کے متعلق مزید اعلان، کنونیشن پر، یا طلوع اسلام بابت نومبر میں ہی کیا جا سکے گا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

پروفیسر رفیع اللہ شہاب
میانوالی

ایشیائی ڈرامہ اور غربتِ اقوام

(زرعی پیداوار میں خود کفیل ہونے کیلئے نامور ماہرین معاشیات کی رائے)

پچھلے دنوں راقم موجودہ دور کے ایک نامور ماہر معاشیات ڈاکٹر گنار میرڈل کی مرتب کردہ ضخیم کتاب —— (ASIAN DRAMA AND THE POVERTY OF NATIONS) کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کتاب میں پاکستان اور اس کے قرب و جوار کے بہت سے ایشیائی ممالک، مثلاً ہندوستان، انڈونیشیا وغیرہ میں غربت کے اسباب اور زرعی پیداوار کی کمی پر بڑی مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں وہ تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ جن پر عمل کر کے زرعی پیداوار میں خود کفیل ہو کر ان ممالک سے غربت کو دور کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ ہمارے علمی حلقوں میں ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا بہت کم چرچا ہے۔ اس کتاب میں راقم کی دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے غذائی پیداوار میں خود کفیل ہونے کے بارے میں پاکستان کے لئے جو تجویز کی ہے، وہ اسلامی احکامات کے مطابق ہے جن کی تفصیلات راقم اپنی تازہ تصنیف "اسلامی ریاست کا مالیاتی نظام"[1] میں پیش کر چکا ہے۔ کتاب کی اہمیت کے لحاظ سے ہم نے اپنے اس مضمون کا عنوان بھی اُسی کے نام پر رکھا ہے۔

غذائی پیداوار میں خود کفیل نہ ہونے کی وجہ سے جس طرح ہمیں غربت کا نشانہ بننا پڑتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حکومت نے پچھلے سال غیر ممالک سے جو غلہ درآمد کیا ہے اس پر زرمبادلہ کی جو خطیر رقم خرچ ہوئی اُسے تو جانے دیجئے، صرف صارفین کو مناسب داموں پر غلہ مہیا کرنے کے لئے حکومت کے خزانے سے ڈیڑھ ارب روپے کی امداد دی گئی۔ خیال فرمائیے کہ اگر یہی صورت حالات مستقلاً قائم رہے تو ہماری غریبی کس طرح دور ہو سکتی ہے؟ بہت سے ممالک نے ڈاکٹر صاحب کے ماہرانہ مشورے پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے اور وہاں اس کے مثبت نتائج سامنے آنے بھی شروع ہو گئے ہیں۔ قارئین نے نوٹ کیا ہوگا کہ ہمارے بعض ماہرین زراعت کبھی کبھی ہمارے کسانوں کو یہ غیرت دلاتے رہتے ہیں کہ بھارتی پنجاب میں اوسط پیداوار ۲۵ من فی ایکڑ تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن ہم ویسی ہی زمین کے مالک ہونے کے باوجود ابھی تک ان سے اوسطاً دس بارہ من فی ایکڑ

---

[1] شائع کردہ ادارہ تحقیقات اسلامی ۔ اسلام آباد

کم پیداوار حاصل کر رہے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بھارتی پنجاب میں ڈاکٹر گنار میرڈل کی تجویز پر عمل شروع ہو چکا ہے اس لئے ہم ڈاکٹر صاحب کی ان تجاویز کو قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں، بایں توقع کہ ملک کو خوراک میں خود کفیل بنانے کے لئے ہمارے ماہرین زراعت اسے درخور اعتنا سمجھیں گے۔

آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے امریکہ کے ایک بین الاقوامی ادارے نے سویڈن کے نامور ماہر معاشیات ڈاکٹر گنار میرڈل کی سرکردگی میں ماہرین معاشیات کی ایک جماعت کے ذریعے یہ معلوم کرنے کا فیصلہ کیا کہ ایشیائی ممالک کی کثیر آبادی کے زراعت سے منسلک ہونے کے باوجود وہاں کی زرعی پیداوار کیوں کم ہے؟ اور یہ کمی چونکہ ان کی غربت کا اہم سبب ہے تو اسے کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے بہت سے معاونین کی مدد سے پاکستان سمیت ان تمام ایشیائی ممالک میں وقتاً فوقتاً رائج ہونے والی انقلابی زرعی اصلاحات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور پھر ان نکات کی نشاندہی کی جن کی وجہ سے ان اصلاحات کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق زرعی اصلاحات کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے۔

۱۔ ملکیت زمین کی حد میں کمی۔
۲۔ زرعی مشینری کا اندھا دھند استعمال۔
۳۔ مزارعین کے حقوق کا قانونی تحفظ۔
۴۔ امداد باہمی کی بنیاد پر کاشتکاری۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تین جلدوں میں دو ہزار صفحات پر مشتمل کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان زرعی اصلاحات کے انقلابی ہونے کے بارے میں جو دعوے کئے گئے ہیں ان کے بہت ہی معمولی نتائج سامنے آئے اور پیداوار میں جو تھوڑا بہت اضافہ ہوا وہ آبادی میں بے پناہ اضافے کی وجہ سے دوبارہ صفر بلکہ صفر سے بھی نیچے جا پہنچا (صفحہ ۱۳۸۰) ڈاکٹر صاحب نے اپنے بہت سے معاونین کے ساتھ ان تمام ایشیائی ممالک کا مفصل دورہ کیا تھا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان ممالک کے کسان بڑے محنتی اور جفاکش ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کی محنت اور جفاکشی سے کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ (صفحہ ۱۳۷۹) اور اگر کسی طرح ان ممالک کی حکومتیں اپنے کسانوں کی محنت اور جفاکشی سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں تو پھر یہ ممالک ایک ہی جھٹکے میں زرعی پیداوار میں خود کفیل ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ان کی تجویز یہ ہے کہ وہ شہری باشندے جو عملاً کاشتکاری کا کام نہیں کرتے، یا دیہات میں رہنے والے غیر حاضر زمیندار ان سب کے لئے آئندہ سے زرعی اراضی کی خرید قانوناً ممنوع قرار دے دی جائے۔ (صفحہ ۱۳۸۰) اور زمین صرف ان کاشتکاروں کے قبضہ میں رہے جو عملاً اس پر کام کرتے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں وہ زرعی پیداوار میں اضافے کے لئے بٹائی سسٹم کو بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اور زرعی اراضی کے بارے میں اس اصول کے قائل ہیں کہ ان کے مالک صرف وہی لوگ ہیں جو ان اراضی پر عملاً کاشت کرتے ہیں۔ ان کے ملک سویڈن اور بہت سے دوسرے یورپی ممالک میں یہی نظام رائج ہے (صفحہ ۱۳۸۰) یہی وجہ ہے کہ زرعی اراضی کی قلت کے باوجود یہ یورپی ممالک خوراک کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ بہت سے زرعی ممالک کو اپنی زاید

زرعی پیداوار برآمد بھی کرتے رہتے ہیں۔

پاکستان سمیت تمام ایشیائی ممالک میں ڈاکٹر صاحب نے غیر حاضر زمینداری یعنی بٹائی سسٹم کا زرعی پیداوار میں اضافے کے لئے غیر مؤثر ہونے کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ یہ نظام چونکہ ان ممالک میں گہری جڑیں پکڑے ہوئے ہے اس لئے اسے یکمشت تو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسے آہستہ آہستہ ختم کرنے کے لئے یہ تجاویز پیش کرتے ہیں کہ آئندہ سے ہر قسم کی اراضی چاہے وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری صرف انہی لوگوں کو دی جائے جو عملاً کاشت کاری کا کام کرتے ہوں۔ اور غیر حاضر زمینداروں کے لئے اس کی خرید ممنوع قرار دی جائے۔ پھر جو غیر حاضر زمیندار پہلے سے موجود ہیں انہیں آہستہ آہستہ ختم کرنے کے لئے ان پر بھاری ٹیکس عاید کئے جائیں (صفحہ ۱۳۸) جس کی وجہ سے یا تو آئندہ وہ اپنی زرعی اراضی پر خود کام کرنے پر مجبور ہو جائیں' یا اس مفت کی آمدنی کے ذریعے کو خیرباد کہہ دیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہ ڈاکٹر صاحب کی تجویز کے مطابق پاکستان سمیت ان تمام ایشیائی ممالک میں زرعی پیداوار بڑھانے کی صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ یہاں غیر حاضر زمینداری یعنی بٹائی سسٹم ختم کر کے اراضی کا مالک صرف ان لوگوں کو رہنے دیا جائے جو عملاً اس پر کام کرتے ہوں۔

ہمارے زرعی ماہرین تو اٹھتے بیٹھتے وسیع پیمانے پر زرعی مشینری مثلاً ٹریکٹر وغیرہ کے استعمال پر زور دیتے رہتے ہیں۔ لیکن دورِ جدید کے اس نامور ماہر معاشیات کی رائے ان کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے زرعی مشینری کا استعمال مفید ضرور ہے۔ لیکن جہاں اس کے استعمال سے دستی کام کرنے والے کسانوں کے بیروزگار ہونے کا خدشہ ہو وہاں زرعی مشینری کے استعمال پر قانوناً پابندی عاید کر دینی چاہیئے کیونکہ ان ایشیائی ممالک میں یہاں کی وافر انفرادی قوت کی محنت سے بدرجہا اولیٰ زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور بٹائی سسٹم ختم کر دینے سے جب ان کسانوں کو یہ یقین ہو جائے گا کہ جس زمین پر وہ محنت کر رہے ہیں وہ ان کی اپنی ہے اور کوئی دوسرا ان کی خون پسینے کی کمائی کو غصب نہ کر سکے گا تو وہ جان توڑ کر محنت کریں گے۔ اس بارے میں روسی کسانوں کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے، کہ ان کے ذاتی کھیت 'جو بمشکل ایک ایک رقبے پر مشتمل ہوتے ہیں' کی اوسط پیداوار اجتماعی فارموں کی اوسط پیداوار سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ راقم نے خود اپنی آنکھوں سے خود کاشت اور بٹائی پر دی ہوئی ایک ہی جیسی زمین کی پیداوار میں یہ تفاوت دیکھا ہے۔

راقم نے اس تجویز کو اس لئے اسلامی احکامات کے مطابق قرار دیا ہے کہ ہمارے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے زمین کی بٹائی کو سود قرار دے کر حرام قرار دے دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو سنن ابو داؤد مطبوعہ مصر جلد ۳ صفحہ ۲۵۵)۔ حنفی فقہ کے مؤسس امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی فتویٰ تھا، بلکہ غیر حاضر زمینداری کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے یہ سنہری اصول پیش کیا تھا کہ ایک مومن کو رزق کے دوسرے چشموں پر قبضہ نہیں کر لینا چاہیئے۔ (ملاحظہ ہو مبسوط للعلامۃ السرخسی جلد ۲۳) موجودہ دور کے ایک دوسرے نامور ماہر معاشیات لارڈ کینز نے بھی زمین کے بٹائی پر دینے کے

معاملے کو سودی معاملہ قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو "اسلام اور سود" از ڈاکٹر انور اقبال قریشی صفحہ ۱۴۹) اس لئے ڈاکٹر گنار میرڈل کی مذکورہ بالا تجویز کا سب سے پہلے ہمیں خیر مقدم کرنا چاہیئے تھا کہ اس پر عمل کر کے ایک طرف تو ہم اپنی غذائی پیداوار میں خود کفیل ہو سکتے ہیں اور دوسرے ایک اسلامی حکم پر عمل کر کے اجر کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

(o)

استدراک

قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے "بٹائی (ربا ہے)" کا ختم کر دینا بے شک ضروری ہے لیکن یہ اس کے منتہیٰ کی طرف جانے کے لئے قدم اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ منتہیٰ اس کا یہ ہے کہ اسلامی نظام (مملکت) تمام افراد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر پر لے اور کھیر اراضی کی کاشت کے لئے جس نظام کو بہتر خیال کرے اسے اختیار کرے۔ زمین کی "ملکیت" کا سوال ہی غیر قرآنی ہے، خواہ وہ ملکیت کاشتکار کی ہو، خواہ زمیندار کی، اور خواہ مملکت کی۔ زمین، نوعِ انسان کو رزق مہیا کرنے کا ذریعہ ہے جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوا ہے۔ اس کی اس حیثیت کو برقرار رکھنا، قرآنی نظام کا فریضہ اور مقصود ہے۔

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۴ء حسب ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے۔

فہرست "ب"

۱۔ محترم بشیر احمد صاحب ۔ ملکوال	۴/-	۶۔ بیگم عبدالقدیر صاحب کراچی	۵۰/-
۲۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب ۔ لاہور	۳۰/-	۷۔ " چودھری لال خان صاحب سانگ کلاں جہلم	۲۲۰/-
۳۔ " ایم۔ اے۔ انصاری صاحب ۔ کراچی	۲۶۱۶/-	۸۔ محترم عبید اللہ جان میاں ملکا ڈھیر (چارسدہ)	۱۰۰/-
۴۔ " حمید الرحمٰن صاحب ۔ لاہور	۲۶/-	۹۔ محترمہ رابعہ ڈار صاحبہ (U.K)	۴۵۰/۴
۵۔ " محمد اختر صاحب ۔ لاہور	۱۵۰/-	۱۰۔ محترم بشیر احمد صاحب ملکوال	۱۰/-

نوٹ:۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۴۵/(K)/۶۵ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ I مورخہ ۱۳ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۱۵/۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) لاہور

"حفاظتِ قرآن کے متعلق شبہات اور اُن کا جواب"

قرآن کریم کی رو سے کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے، ان میں ایک "کتاب" بھی ہے۔ یعنی خدا کی کتابوں پر ایمان۔ ان کتابوں میں وہ بھی شامل ہیں جو حضور نبی اکرم سے پہلے کے انبیاء کرام کو خدا کی طرف سے ملیں (واضح رہے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق، کتاب ہر نبی کو ملی تھی۔ "نبی بلا کتاب" کا عقیدہ قرآن کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے)۔ اور اس کتاب پر بھی جو حضورؐ پر نازل ہوئی، یعنی قرآن کریم ـــ ان میں فرق یہ ہے کہ انبیائے سابقہ کی کتابوں پر صرف اس حد تک ایمان ضروری ہے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں مختلف انبیاءؑ کو ملیں لیکن اس کے بعد وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہیں ـــ ان میں تحریف ہو گئی اور یا وہ بھلا دی گئیں یا حوادثِ ارضی و سماوی کی نذر ہو گئیں۔ ان کے برعکس، قرآن مجید جو اس وقت امت کے پاس ہے، حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے رسول اللہ پر نازل کیا ... اور جسے رسول اللہ نے امت کو دیا۔ اس میں ایک نقطے یا شعشے کا بھی فرق نہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ جو ہمارا دعویٰ ہے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے، تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ منزل من اللہ کتاب، اس آسمان کے نیچے، اب صرف قرآن مجید ہے، دیگر مذاہب کی کتابیں جنہیں وہ اپنے بانیانِ مذاہب کی طرف منسوب کرتے ہیں، اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔

مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ جو کتابیں دیگر اہل مذاہب اپنے انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں، وہ اپنی اصل شکل میں موجود نہیں، ایسی محکم شہادات پر مبنی ہے جن کی تردید وہ اہل مذاہب کر نہیں سکتے۔ لہٰذا انہوں نے اس سے عاجز آ کر یہ سازش شروع کی کہ خود قرآن کے متعلق یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ بھی اپنی شکل میں موجود نہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روایات وضع کیں اور کثرت سے وضع کیں اور انہیں اُن کتابوں میں داخل کر دیا جنہیں مسلمان "صحیح ترین کتب احادیث" قرار دیتے ہیں۔ یہ عقیدہ کہ قرآن کریم کو خود رسول اللہ نے جمع اور مرتب شدہ شکل میں امت کو نہیں دیا تھا، اسے بعد میں مرتب کیا گیا۔ مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن کے مختلف نسخے تھے جن میں باہمی اختلاف تھا۔ قرآن کا جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے جمع کیا اس میں بھی تغیر و تبدل ہوا تھا[1]۔ انہی روایات کے پیدا کردہ ہیں۔ انہی عقائد میں ایک عقیدہ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا بھی ہے۔

(لہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عقیدہ کی رو سے تسلیم یہ کیا جاتا ہے کہ ؂

(۱) خدا کی طرف سے کچھ احکام نازل ہوتے تھے۔ انہیں پھر وہ منسوخ کر دیتا تھا۔ قرآن کی وہ آیات جن میں وہ احکام دیئے گئے تھے، اگر لکھی ہوئی ہوتیں تو رسول اللہؐ صحابہؓ کو حکم دے دیتے کہ انہیں مٹا دیا جائے۔ اگر وہ رسول اللہؐ اور صحابہؓ کو حفظ یاد ہوتیں تو خدا انہیں ان کے حافظہ سے محو کر دیتا۔ یہ وہ آیات ہیں جن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ ان کا حکم بھی منسوخ ہے اور تلاوت بھی۔

(۲) دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم میں تو موجود نہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ اور

(۳) تیسری قسم ان آیات کی ہے جو قرآن کریم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں، ان تینوں قسموں کی آیات میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا گیا کہ خدا نے اس کا حکم یا اس کی تلاوت منسوخ کر دی ہے۔ نہ ہی کہیں یہ آیا ہے کہ ایسی آیات بھی تھیں جو پہلے نازل ہوئی تھیں لیکن بعد میں انہیں حافظوں سے بھی محو کر دیا گیا اور جہاں جہاں وہ لکھی ہوئی تھیں وہاں سے بھی انہیں مٹا دیا گیا۔ یہ سب کتب روایات میں ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے قرآن کے متعلق بیسیوں شکوک ابھریں گے اور اس پر سینکڑوں اعتراضات وارد ہوں گے۔ ہمارے علماء کرام کی طرف سے ان کا کیا جواب دیا جاتا ہے۔ وہ قابلِ غور ہے۔ کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے — البلاغ — جس کے مدیر، مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادہ محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس مجلہ کی ستمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں (خود مدیر کے قلم سے) ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان وہی ہے جو زیر نظر مقالہ کا ہے (ہم نے وہی عنوان دانستہ قائم رکھا ہے) اس مقالہ کے متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ اقتباسات طویل ہیں لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی اس لئے ہم نے اس طوالت کو گوارا کر لیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

البلاغ کے اقتباسات

مشہور مستشرق ایف۔ بُہل (F - BUHAL) نے دعویٰ کیا ہے کہ عہدِ رسالتؐ کی ابتدا میں قرآن کریم کی آیات لکھی نہیں جاتی تھیں بلکہ ان کی حفاظت کا سارا دارومدار آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حافظے پر تھا۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ ابتدائی زمانے کی قرآنی آیات محفوظ نہ رہی ہوں۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں بُہل نے قرآن کریم کی دو آیات پیش کی ہیں ؂

(۱) سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰٓ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (سورۃ اعلیٰ: ۶)

؂ (حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان امور کی تفصیل اس مقالہ میں آ چکی ہے جو طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۶ء میں "اختلافِ قرأت" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ مزید تفصیل ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب — مقامِ حدیث — میں ملے گی۔

؂ F-BUHL "EMCYCLOPAEDIA OF ISLAM P.1067 V.3 "KORAN"

ہم آپ کو پڑھائیں گے۔ پھر آپ بھولیں گے نہیں مگر جو کچھ اللہ چاہے۔

(۲) مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔ (بقرہ ۱۰۶)

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے۔

لیکن جو شخص بھی قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ادنیٰ واقفیت رکھتا ہو وہ اس اعتراض کی لغویت محسوس کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کی منسوخ آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب جبریل امین علیہ السلام قرآن کریم کی کچھ آیات لے کر نازل ہوتے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم انہیں بھول جانے کے خوف سے بار بار دہراتے رہتے تھے اور اس میں آپؐ کو شدید تعب ہوتا تھا۔ اس آیت میں آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ آپ کو یاد کرنے کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ لہذا آپ ان آیات کو بھول نہیں سکیں گے۔ لیکن اس پر یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات تو بعد میں منسوخ ہونے کے سبب حافظے سے محو ہو گئیں اس کا جواب دینے کے لئے الّا ما شاء اللہ (مگر جو کچھ اللہ چاہے) کے الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالےٰ کسی آیت کو منسوخ کرے گا تو صرف اسی وقت وہ آیت آپ کے حافظے سے محو ہو سکے گی اس کے بغیر نہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات منسوخ ہونے کی بنا پر آپؐ کے اور صحابہؓ کے حافظوں سے محو ہو جائیں گی۔

لہذا ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کو جب اللہ تعالےٰ نے منسوخ فرما دیا تو ان کی کتابت کو مٹانے کا حکم تو دیا ہی گیا مگر ساتھ ساتھ انہیں لوگوں کے حافظے سے بھی محو کر دیا گیا۔ ورنہ جہاں تک غیر منسوخ آیتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو صراحۃً کہا جا رہا ہے کہ آپ انہیں کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ اس سے یہ بات آخر کیسے نکل آئی کہ جو آیتیں منسوخ نہیں ہوئیں ان کے فراموش ہو جانے کا بھی کوئی امکان ہے؟

دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مارگولیوتھ نے پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ مسند احمدؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ سے کچھ آیتیں گم ہو گئی تھیں۔

یہاں مارگولیوتھ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے۔

عن عائشۃؓ زوج النبی صلے اللہ علیہ وسلم قالت لقد انزلت اٰیۃ الرجم و رضعات الکبیر عشرًا فکانت فی ورقۃ تحت سریر فی بیتی فلما اشتکیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشاغلنا بامرہ و دخلت دویبۃ لنا فاکلتھا۔ؒ

ؒ مسند احمدؒ حصہ زوائد مسندات عائشہؓ ص ۲۶۹ ج ۶ دار صادر بیروت

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رجم کی آیت اور بڑے آدمی کی دس رضعات کی آیت نازل ہوئی تھیں۔ یہ آیتیں میرے گھر میں ایک تخت کے نیچے کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو (مرض وفات کی) تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپؐ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ ہمارا ایک پالتو جانور تھا وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھا لیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ نے جن آیتوں کا ذکر فرمایا ہے یہ باجماع امت وہ آیتیں ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی۔ خود حضرت عائشہؓ بھی ان آیتوں کے منسوخ التلاوۃ ہونے کی قائل ہیں لہٰذا اگر انہوں نے یہ آیات کسی کاغذ پر لکھ کر رکھی ہوئی تھیں تو اس کا منشا سوائے ایک یادگار کے تحفظ کے کچھ نہ تھا ورنہ اگر یہ آیات حضرت عائشہ کے نزدیک قرآن کریم کا جزو ہوتیں تو وہ کم از کم ان کو تو یاد تھیں وہ ان کو قرآن کریم کے نسخوں میں درج کراتیں لیکن انہوں نے ساری عمر ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت عائشہ کے نزدیک یہ آیات محض ایک علمی یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں اور قرآن کریم کی دوسری آیات کی طرح اس کو مصحف میں درج کرانے کا کوئی اہتمام ان کے پیش نظر بھی نہیں تھا۔ لہٰذا اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی حرف نہیں آتا۔"

یہ ہیں وہ جوابات جن سے یہ حضرات مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے معترضین کو اگر قائل نہیں کر دیا تو کم از کم ان کا منہ بند کر دیا۔ ہم پوچھتے ہیں اپنے قارئین (یا مخصوص قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ) سے کہ (مستشرقین کو تو چھوڑیئے) کیا وہ ان جوابات سے مطمئن ہو گئے ہیں، اور ان سے ان کے شکوک و شبہات دور ہو گئے ہیں؟ شکوک و شبہات کا دور ہونا تو ایک طرف ان سے تو مزید شکوک و شبہات ابھر آتے ہیں۔ (مثلاً) پہلے اس آیت کو لیجئے جسے حضرت عائشہؓ کا جانور کھا گیا تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ ان آیات میں سے تھی جنہیں خدا نے منسوخ قرار دے دیا تھا۔ ان آیات کے متعلق پہلے کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ حکم دے دیتے تھے کہ اگر یہ آیات کہیں لکھ رکھی ہیں تو انہیں مٹا دیا جائے۔ اور اگر یہ حافظہ میں ہوتیں تو خدا خود انہیں رسول اللہؐ اور دوسرے لوگوں کے حافظہ سے محو کر دیتا۔ یہ آیت حضرت عائشہ کے پاس لکھی ہوئی شکل میں موجود تھی لیکن انہوں نے اسے رسول اللہؐ کے حکم دینے کے باوجود مٹایا نہیں، کیا رسول اللہؐ کے زمانے میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسول اللہؐ ایک بات کا حکم دیتے تو صحابہؓ (اور وہ بھی حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ) اس کی تعمیل نہ کرتے؟ اس کی توجیہہ یہ بتائی گئی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اسے ایک یادگار کے تحفظ کے طور پر کسی کاغذ پر لکھ رکھا ہوگا! سوال یہ ہے کہ ان آیات کو بطور یادگار محفوظ رکھنے سے کیا ارشاد رسول اللہؐ کی تعمیل اور منشائے خداوندی کی تکمیل (کہ ان آیات کو مٹا دیا جائے) ہو جاتی تھی؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ تو کیا اسے باور کر لیا جائے کہ اُس زمانے میں ارشاداتِ رسول اللہؐ کی تعمیل اور منشائے خداوندی کی تکمیل اسی طرح ہوا کرتی تھی؟

اور پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ ایسا صرف حضرت عائشہؓ نے، اور وہ بھی صرف ایک آیت کے سلسلہ میں کیا تھا! کیا معلوم کتنے صحابہؓ نے ان آیات کو لکھ رکھا تھا؟ اور یہ بھی کیا معلوم کہ وہ کہاں کہاں تشریف لے جا چکے ہوں گے اور ان تک رسول اللہؐ کا یہ حکم پہنچا بھی ہوگا یا نہیں کہ ان آیات کو مٹا دیا جائے! وہ تو ان آیات کو

قرآن کریم کا جزو سمجھتے تھے اور اسی حیثیت سے انہوں نے انہیں محفوظ رکھ چھوڑا ہوگا! کیا اس سے ان آیات کی تنسیخ کا مقصدِ خداوندی پورا ہو گیا تھا؟ اور کیا بعد ازاں جب صحابہؓ ایک دوسرے سے ملتے ہوں گے تو ان آیات کے متعلق نزاعات پیدا نہ ہوتی ہوں گی کہ یہ قرآن کا جزو ہیں یا نہیں؟

اب آیئے اس آیت کے متن کی طرف جس کے متعلق عثمانی صاحب نے فرمایا ہے کہ خدا نے اسے منسوخ کر دیا تھا اور اسے حضرت عائشہؓ کا جانور کھا گیا تھا۔ اس آیت میں ایک حکم زانی اور زانیہ کو سنگسار (رجم) کرنے کا تھا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار اہل سنت والجماعت کی نہایت قابل اعتماد کتب تفاسیر میں ہوتا ہے۔ دیکھئے کہ اس میں اس آیت کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ اس میں سورۂ نور کی دوسری آیت (جس میں حکم خداوندی ہے کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا سو سو کوڑے ہے) کی تفسیر میں یہ لکھا ہے۔

موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا لوگو! اللہ تعالٰے نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل کی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کی۔ یاد کی اور اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد بھی رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا چھوڑ کر رہ جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ۔ خواہ مرد ہو یا عورت جبکہ اس کے زنا پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مطول موجود ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو! خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر کیا اور فرمایا رجم ضروری ہے۔ وہ اللہ تعالٰے کی حدود میں سے ایک ہے خود حضورؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمر بن خطاب، عبداللہ بن عوف اور فلاں اور فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو! تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں جو رجم کو اور شفاعت کو اور عذاب قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے ہوں۔ مسند احمد نے لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے فرمایا۔ رجم کے حکم کے انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا۔ الخ۔ امام ترمذی بھی اسے لائے ہیں اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابو یعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زید بن ثابت بھی تھے۔ آپ نے

فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کاری کریں تو انہیں ضرور رجم کر دو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا سنو! ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ نے فرمایا کہ میں تمہاری تشفی کر دیتا ہوں کہ ایک شخص نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا یا رسول اللہ آپ رجم کی آیت لکھ لیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ اب تو میں اسے نہیں لکھ سکتا یا اسی کے مثل۔ یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔ پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی۔ یا پھر تلاوت میں منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا۔

آپ نے غور فرمایا کہ حفاظت قرآن مجید کے سلسلہ میں ہماری کتب احادیث و تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے؟ اور آپ کو شاید اس کا بھی علم ہوگا کہ ہمارے ہاں رجم کا یہ حکم بدستور چلا آ رہا ہے۔ شرعی قوانین کی رو سے غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کو کوڑے مارے جاتے ہیں اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ اور ایسا اس آیت کی رو سے کیا جاتا ہے جو قرآن میں تو موجود نہیں لیکن اس کا حکم بدستور موجود ہے۔

اور اس پر ہم مسلمانوں کو شکایت ہوتی ہے کہ غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن محفوظ نہیں! اور ہمارے مولانا حضرات ان اعتراضات کا وہ جواب دیتے ہیں جسے آپ تقی صاحب کے مقالہ میں دیکھ چکے ہیں۔ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) کس قدر مظلوم ہے ہمارا قرآن!

(۰)

اب آئیے قرآن میں ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی طرف۔ ہم اس سلسلہ میں پہلے بھی بہت کچھ اور متعدد بار لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ البلاغ نے اسے حفاظت قرآن کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کیا ہے، اس لئے اس عقیدہ کی (بار دگر) وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ عقیدہ حال کا وضع کردہ نہیں بلکہ اس زمانے سے چلا آ رہا ہے جب سے وضعی روایات وجود میں آئیں اور اس وقت تک چلا جائے گا جب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی کہ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اٰباءنا۔ (۲/۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔" اندھی تقلید اور قرآنی بصیرت دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ اسی مسلک تقلید کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے معتد بہ حصہ کو منسوخ قرار دے رکھا ہے اور یہ نسخ صرف قرآن کی دوسری آیات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کی آیتیں احادیث سے بھی منسوخ کی جاتی ہیں۔

اس عقیدہ کی سند میں قرآن کریم کی وہی آیت پیش کی جاتی ہے جسے تقی صاحب نے اپنے مقالہ میں درج کیا ہے یعنی:-

ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا۔ (۲/۱۰۶)

قرآن میں ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی تائید اس آیت سے تو نہیں ہوتی، البتہ اس ترجمہ سے ہوتی ہے جسے تقی صاحب نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے۔ وہ اس کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:-

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کریں گے یا بھلا دینگے۔ ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئینگے۔

اس آیت کا "فعل مستقبل" میں ترجمہ کرنے سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ "خدا ایسا کرے گا" یہ ترجمہ قرآنی مفہوم کے خلاف ہے اور اپنے مخصوص عقیدہ کی تائید کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ شاہ رفیع الدین اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

جو موقوف کرتے ہیں ہم آیتوں سے یا بھلا دیتے ہیں ہم ان کو۔ لاتے ہیں ہم بہتر ان سے یا مانند ان کے۔

مولانا محمود الحسن (مرحوم) نے یوں ترجمہ کیا ہے۔

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر۔

یعنی یہ نہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں خدا نے کہا تھا کہ (نقی صاحب کے ترجمہ کے مطابق) قرآن کی جن آیتوں کو ہم منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے تو ان سے بہتر یا ان جیسی آیات اور بھیج دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے اپنی وحی کا ایک اسلوب بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم ایسا کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے، اسے غور سے سنیئے۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے تمام انبیاء کرامؑ خدا کا پیغام لاتے رہے۔ مخالفین کا اعتراض تھا کہ اگر قرآن کی تعلیم بھی وہی ہے جو پہلے انبیاء کرام کی تھی تو پھر قرآن میں ان کتابوں سے مختلف احکام کیوں ہیں جنہیں وہ اپنی آسمانی کتابیں کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جو احکام وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی منسوخ کر دیتی تھی اور ان کی جگہ ان سے بہتر احکام (یعنی ایسے احکام جو زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں) دیئے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کرام کی وحی اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتی تھی۔ اس میں تحریف و الحاق بھی ہوتا تھا اور اس کا اکثر حصہ حوادث ارضی و سماوی کی وجہ سے یا خود انسانی دسیسہ کاریوں کے باعث یا ویسے ہی ذہنوں سے فراموش ہو جاتا تھا، بعد میں آنے والا رسول اس فراموش شدہ حصہ کو من جانب اللہ حاصل کر کے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ قرآن چونکہ سب سے آخر میں آنے والی کتاب تھی اس لئے اس نے تمام سابقہ احکام کو جو وقتی طور پر نافذ العمل ہونے کے لئے دیئے گئے تھے، منسوخ کر دیا اور ان کی جگہ ایسے اصولی احکام دے دیئے جو ہمیشہ کے لئے رہنے والے تھے۔ سابقہ انبیاء کرام کی تعلیم کا وہ حصہ جو فراموش کر دیا گیا تھا لیکن جس کا باقی رکھا جانا مقصود تھا اسے قرآن دوبارہ لے آیا۔ اس کی وجہ سے اہل کتاب قرآن میں بعض باتیں ایسی پاتے تھے جو ان کے احکام کے خلاف جاتی تھیں (یعنی جنہیں قرآن نے منسوخ کر دیا تھا اور ان کی جگہ دوسرے احکام نے لے لی تھی) یا ایسی باتیں جس کا ان کتابوں میں کہیں ذکر نہ تھا جو ان کے پاس اُس وقت موجود تھیں (یعنی وہ حصہ جو ان کے ہاں فراموش ہو چکا تھا اور جسے قرآن دوبارہ لایا تھا) وہ اس تبدیلی کو بطور اعتراض پیش کرتے تھے کہ اگر قرآن اسی خدا کی طرف سے ہے جس خدا نے سابقہ کتابیں نازل کی تھیں تو پھر قرآن بعینہٖ اُن اُن کتابوں جیسا کیوں نہیں۔

دیکھئے، قرآن کریم ان کی ان بہانہ سازیوں کی پردہ کشائی کس انداز سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (اے رسولؐ) اہل کتاب ہوں یا مشرکین عرب، وہ اسے گوارا ہی نہیں کرتے کہ وحی تمہاری طرف نازل ہو۔

ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب و لا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم - واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم - (۲/۱۰۵)

اہل کتاب ہوں یا مشرکین عرب جو بھی (قرآن کی صداقت سے) انکار کرتے ہیں (ان کے اس انکار کی درحقیقت وجہ یہ ہے کہ) وہ اسے چاہتے ہی نہیں کہ خدا کی یہ خیر و برکت تمہاری طرف نازل ہو جائے۔ (لیکن یہ تو خدا کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ لوگوں کی منشاء کے مطابق) وہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کر لیتا ہے۔ وہ صاحب فضلِ عظیم ہے۔

اہل کتاب میں سے یہودی اس انکار و مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان کی اس مخالفت کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت (بنی اسرائیل کو چھوڑ کر) بنی اسماعیل کی طرف چلی جائے[1]۔ لیکن اعتراضات اس قسم کے کرتے تھے کہ قرآن کے احکام ان کی شریعت کے خلاف کیوں ہیں (مثلاً ان کے ہاں اونٹ حرام تھا، قرآن نے اسے حلال قرار دے دیا۔ وغیرہ وغیرہ) اس کے جواب میں قرآن نے یہ بتایا کہ وحی کا اسلوب یہ ہے کہ ما ننسخ من ایۃ او ننسھا نأت بخیر منھا او مثلھا - (۲/۱۰۶) کہ ہم جن سابقہ احکام کو منسوخ کر دیتے ہیں، ان کی جگہ بعد میں آنے والے نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھیج دیتے ہیں۔ اور سابقہ تعلیم میں سے جو حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن میں کارفرما ہے۔ سورہ نحل میں منکرین قرآن کا اعتراض ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

واذا بدلنا ایۃ مکان ایۃ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر - بل اکثرھم لا یعلمون - (۱۶/۱۰۱)

جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں۔ اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ (اے رسول) تو یہ کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے (کیونکہ یہ ان کتابوں سے مختلف ہے جو ہمارے پاس ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے نہیں کہ (وحی کا اسلوب کیا ہے)

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔

یہ تو ہوا کتب سابقہ کے ان احکام کے متعلق جنہیں خدا خود منسوخ کر کے، وحی جدید میں ان سے بہتر احکام عطا کر دیتا تھا۔ ان میں ایسے احکام بھی شامل تھے جنہیں اہل کتاب نے اپنی طرف سے وضع کر کے شامل کتاب کر رکھا تھا۔ اس کی شہادت قرآن کریم کے مختلف مقامات میں موجود ہے (مثلاً ۳/۹۳)۔ ان تحریفات

---

[1] قریش اسے کیوں نہیں پسند کرتے تھے، اس کی ..... وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ نبوت ہمارے سرداروں میں سے کسی کو ملنی چاہیئے تھی۔ اس غریب اور یتیم کو کیوں مل گئی؟

کو جدید وحی منسوخ کر کے، ان کی جگہ اصلی احکام دے دیتی تھی۔ سورہ حج میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

> وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِہٖ ۚ فَیَنۡسَخُ اللّٰہُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ۔
>
> اور ہم نے (اے رسول!) تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ اس کے بعد اس کے تلاوت کردہ (پیغاماتِ خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ ملا نہ دیا ہو۔ (شیاطین یہ کرتے تھے اور) اللہ ان کی اس آمیزش کو (دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا اور اپنے پیغامات کو پھر محکم بنا دیتا تھا۔ اللہ علیم و حکیم ہے۔

یہ تھا وحی کے پروگرام کا اسلوب۔ یعنی ہر رسول کی طرف بھیجی جانے والی وحی، سابقہ وحی کے ان احکام کو منسوخ کر دیتی تھی جن کا باقی رکھا جانا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ خواہ وہ احکام، سابقہ کتب میں، اپنی اصل شکل میں موجود ہوں، اور خواہ وہ الحاقی یا محرف ہوں۔ ان کی جگہ ان سے بہتر احکام نازل کرائے جاتے تھے (نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ۔ $\frac{2}{106}$)

اہلِ کتاب کے اپنی کتابوں کے بعض پیغامات کے فراموش کر دینے کا بھی ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ (وَ نَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوۡا بِہٖ۔ $\frac{5}{13-14}$)۔ اگر ان فراموش کردہ پیغامات کا موجود رکھنا مقصود ہوتا تو جدید وحیِ خداوندی انہیں بحال کر دیتی۔

(۰)

ان تصریحات کی روشنی میں دیکھیے کہ آیۂ تنسیخ ($\frac{2}{106}$) کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی بھی دقت پیش آتی ہے۔ یعنی اس مفہوم کے سمجھنے میں کہ وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جن سابقہ احکام کا باقی رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا انہیں منسوخ کر کے، وحیِ جدید میں ان سے بہتر احکام دے دیئے جاتے تھے۔ اور وحیِ سابقہ کے جن احکام کو علیٰ حالہٖ رکھنا مقصود ہوتا تھا، وحیِ جدید میں ان کی تجدید کر دی جاتی تھی خواہ اہلِ کتاب نے انہیں فراموش ہی کیوں نہ کر دیا ہو۔ اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر سوچیے کہ کیا اس عقیدہ کی کوئی اصل ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم کی اپنی آیات ... دوسری آیات سے منسوخ ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ اور ایسی بھی جنہیں پہلے نازل کیا گیا تھا پھر انہیں محو کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ بھی کہ قرآن کی آیات روایات سے منسوخ ہیں۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض موجودہ آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں لیکن خدا نے بتایا نہیں کہ کون سی آیات، کونسی سے منسوخ ہو چکی ہیں تو اس سے قرآن سمجھنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کو اس سے کیا غرض کہ خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے، اور رسول اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے؟ اسے تو صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا

ہے اس میں کہیں فرق نہ آجائے۔ خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات۔ مجوس کی مخترعات ہوں یا صنادید عجم کی خرافات۔

اب آیئے تقی صاحب کی پیش کردہ دوسری آیت کی طرف۔ یعنی

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۔ (۸۷/۶)

اس کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے۔

ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں مگر جو کچھ اللہ چاہے۔

اس آیت کو انہوں نے اس عقیدہ کی تائید میں پیش کیا ہے کہ خدا پہلے (قرآن میں) کچھ آیتیں نازل کر دیتا تھا پھر انہیں واپس لے جاتا تھا اور انہیں حضورؐ کے حافظہ سے بھی محو کر دیتا تھا۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ سرے سے قرآن کریم کے خلاف ہے کہ خدا پہلے کچھ آیات نازل کرتا تھا اور پھر انہیں واپس لے جاتا تھا۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۔ (۱۷/۸۶)

اگر ہم چاہتے تو جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے اٹھا کر لے جاتے اور پھر کوئی قوت تیری طرف سے ہمارے خلاف وکالت کر کے (اسے واپس نہ دلا سکتی)

"اگر ہم چاہتے" سے واضح ہے کہ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا اس لئے ایسا نہیں کیا۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضورؐ پر نازل کیا اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے گیا۔

اس کے بعد آیئے آیت (۸۷/۶) کی طرف جس سے یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ جو کچھ حضورؐ کی طرف نازل کیا جاتا تھا اسے آپ خود تو نہیں بھلا سکتے تھے لیکن جس حصہ کے متعلق خدا چاہتا وہ آپ کے حافظہ سے محو ہو جاتا۔ اس کے لئے سند ہے "اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" جس کا مطلب لیا جاتا ہے "بجز اس کے جس کے لئے خدا کی مشیت ہو کہ آپ بھول جائیں"۔

تَنْسٰى کا مادہ (ن۔ س۔ ی) ہے جس کے معنی بھول جانے کے علاوہ، ترک کر دینے۔ حفاظت چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ المنار، علامہ محمد عبدہٗ (مرحوم) کی بڑی مستند اور مشہور تفسیر ہے، جسے ان کے شاگرد علامہ رشید رضا (مرحوم) نے مرتب کیا ہے۔ آیت (۸۷/۶) کی تشریح میں وہ نسیان کے مختلف مطالب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

اگر اس کے معنی بھول جانے کے بھی لئے جائیں تو بھی الا ما شاء اللہ اس کی نفی کر دیتا ہے۔ کیونکہ "استثناء بالمشیت" اسلوب قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے (یعنی جہاں الا کے بعد ما شاء اللہ وغیرہ الفاظ آئیں جن سے مراد مشیت خداوندی ہوتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا۔) جیسا کہ دوسری جگہ ہے۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

إِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ۔ (۱۱)۔ یعنی غیر مقطوع۔ اور استثناء میں یہ نکتہ ہے کہ یہ ظاہر کر دینا مقصود ہے کہ یہ امور جو ثابت اور دائمہ ہیں، خدا کی مشیت سے ایسے ہیں، اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایسے نہیں۔ اگر خدا اس کے خلاف چاہتا تو ان کو ویسا ہی بنا دیتا۔ (لیکن اس نے ایسا چاہا نہیں۔)

(المنار۔ جلد اول۔ صفحہ ۴۱۹-۴۱۶۔ زیر منسوخ و منسیٰ[1])

إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ کے ان معانی کی رو سے، سورۃ الاعلیٰ کی آیت ۶ کا صحیح مفہوم یہ ہو گا کہ

اے رسول! جو کچھ ہم تجھے وحی کی رو سے پڑھائیں گے تو اس میں سے نہ تو کچھ ترک کر سکے گا، نہ فراموش۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ یہ حتمی بات ہے۔

(۰)

یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے، قرآن کی صحیح پوزیشن۔ اللہ تعالیٰ نے یوم اول سے جو کچھ حضورؐ پر نازل فرمایا، اور یوم آخر تک جب اس کے اتمام کا اعلان کر دیا، اس کا کوئی ایک لفظ بھی نہ منسوخ ہوا، نہ تبدیل نہ فراموش۔ یہ سارے کا سارا قرآن حضورؐ نے خود لکھوا کر، زبانی یاد کرا کر، صحابہؓ کو دیا اور وہی قرآن بلا تغیر و تبدل امت کے پاس متواتر چلا آ رہا ہے۔ جس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہو (۹/۱۵) اس میں تغیر و تبدل کیسے ہو سکتا ہے؟ (مسلمان تو ایک طرف) خود غیر مسلموں کی تحقیق بھی اس کی شاہد ہے۔

یہ تو ہے، قرآن کریم کی رو سے حفاظت قرآن کی پوزیشن، لیکن وضعی روایات نے اس کا کچھ بھی غیر مشکوک نہیں رہنے دیا۔ اور انہی کے سہارے غیر مسلم اس کے خلاف اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جو جواب دیا جاتا ہے، اس کا نمونہ آپ تقی صاحب کے مقالہ میں دیکھ چکے ہیں۔ یاد رکھئے! جب تک آپ ان وضعی روایات کو صحیح اور مستند تسلیم کرتے رہیں گے، نہ قرآن کی حفاظت ثابت ہو سکے گی اور نہ ہی معترضین کے کسی اعتراض کا اطمینان بخش جواب دیا جا سکے گا۔ اس قسم کی روایات کے متعلق صحیح موقف وہی ہے جسے (مولانا) ابو الکلام آزاد (مرحوم) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔
>
> (ترجمان القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۰۰)
> شائع کردہ۔ مکتبہ برہان، دہلی۔

---

[1] (لغات القرآن۔ پرویز۔ صفحہ ۱۶۱۸)

لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ وہی بات (مولانا) آزاد کہیں تو وہ امام الہند کے امام الہند رہیں لیکن وہی بات طلوع اسلام کہے تو اسے منکرِ حدیث، کافر، مرتد قرار دیا جائے۔

لیکن طلوع اسلام کو منکرِ حدیث اور کافر قرار دینے سے آپ اپنے آپ کو تو مطمئن کر سکتے (بلکہ فریب دے سکتے) ہیں، غیر مسلم معترضین کے اعتراضات کا جواب نہیں دے سکتے۔ قرآن مجید کی حفاظت ثابت نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے تو (مولانا) آزاد کی طرح "منکرِ حدیث" بننا اور اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب دینے کے لئے قرآن کو سند و حجت قرار دینا ہی پڑے گا۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار۔ صبح ۸ بجے

بمقام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

فون نمبر (۸۰۸۰۰)

لائل پور میں

بروز جمعہ

(بذریعہ ٹیپ) ۵½ بجے سہ پہر۔

بمقام دفتر بزمِ طلوع اسلام

۴۵ کوتوالی روڈ (متصل حیات سرجری کلینک)

لائل پور۔ فون نمبر (۲۴۹۴)

ملتان میں

بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بعد نماز مغرب

بمقام۔ دفتر شاہ سنز

بیرون پاک گیٹ ملتان

فون:۔ (۲۰۷۱)

سیالکوٹ میں

ہر اتوار (بذریعہ ٹیپ) صبح ۸ بجے

مکان نمبر ۸۹/۴ چوہدری محمد دین ولد کمال دین

نمائندہ بزم طلوع اسلام

موضع ڈاکخانہ گوہد پور (محلہ غربی) سیالکوٹ

کراچی میں

ہر اتوار

۹½ بجے صبح

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام۔ دفتر بزمِ طلوع اسلام

دار القائمہ ۲۰-۱/بی

بس سٹاپ ۶۔ ناظم آباد III۔ کراچی ۱۸

(ٹیلی فون۔ ۶۱۰۴۶۸)

کوئٹہ میں

(بذریعہ ٹیپ)۔ ہر اتوار

۲½ بجے دوپہر

بمقام۔ ۲۸ گوردت سنگھ روڈ

فون نمبر ۷۰۷۰۰

کوئٹہ

راولپنڈی میں

ہر جمعہ

(بذریعہ ٹیپ)

۵ بجے سہ پہر

بمقام۔ جی ۱۹۶ لیاقت روڈ

راولپنڈی

واہ میں

ہر جمعہ

(بذریعہ ٹیپ)

بعد نماز جمعہ

بمقام۔ ۱۵ جہلم روڈ

واہ (WAH)